اجراء حسبِ ارشاد: شیخ الحدیث حضرت مولانا مشرف علی تھانوی قدس سرہ

مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۴ | ذوالحجۃ ۱۴۴۵ھ | جولائی ۲۰۲۳ء | شمارہ ۷

الباطن

(فکر اصلاح باطن) (قسط اول)

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۵۰ روپے زر سالانہ =/۶۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

وعظ

الباطن

(فکر اصلاح باطن) قسط اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ ازالہ غفلت وضرورت اصلاح باطن کے متعلق بمقام مسجد مدرسہ احیاء العلوم الٰہ آباد ۱۳ ربیع الاول ۱۳۲۶ ھ یوم جمعہ ایک گھنٹہ ۵۵ منٹ چوکی پر بیٹھ کر خطاب فرمایا جس کو حضرت مولانا محمد مصطفیٰ بجنوری صاحب نے قلمبند فرمایا۔ حکیم الامت نے ظاہر کی اصلاح کے ساتھ باطن کی اصلاح کرنے کی ترغیب اور اس کا طریقہ بیان فرمایا انتہائی مفید وعظ ہے۔

اللہ تعالیٰ قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔

نوٹ: وعظ کی طوالت کے پیش نظر دو قسطوں میں طبع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

خلیل احمد تھانوی

۶۔ شوال ۱۴۴۴ھ

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱..........	ایک ضروری مضمون..........	۷
۲..........	انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سہل ہونے کی وجہ..........	۷
۳..........	اہل دنیا کا حال..........	۸
۴..........	تصنع بھی عجیب مرض ہے..........	۹
۵..........	علوم محمودہ اور مذمومہ کی مثال..........	۱۰
۶..........	حکماء اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں فرق..........	۱۱
۷..........	علوم حکماء اور علوم شرعیہ کا فرق..........	۱۲
۸..........	دقیق علوم وفنون کا مقصود..........	۱۴
۹..........	شفقت انبیاء علیہم السلام..........	۱۴
۱۰..........	کلام الٰہی کی نئی بات..........	۱۵
۱۱..........	کلام اللہ میں مبالغہ نہیں..........	۱۶
۱۲..........	بعض شفیق مصنفین..........	۱۷
۱۳..........	اظہار لیاقت سے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچتا..........	۱۸
۱۴..........	شفقت کا مقتضا..........	۱۸
۱۵..........	حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان کریمی..........	۱۹
۱۶..........	علماء ربانی کی شان..........	۲۰
۱۷..........	مضامین کے مفید ہونے کی عجیب مثال..........	۲۱
۱۸..........	مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوتی..........	۲۲
۱۹..........	الفاظ حدیث کے لغوی معنی..........	۲۲
۲۰..........	نسخۂ کیمیا..........	۲۳
۲۱..........	کمال کی قدر ومنزلت..........	۲۵
۲۲..........	کمال کی بات..........	۲۶

۲۳..........	بے قیمت مفید شے..	۲٦
۲۴..........	بیش قیمت بے کار شے..	۲۷
۲۵..........	ایک خطرناک روحانی مرض..	۲۸
۲٦..........	طالبان دین کا تمسخر..	۲۹
۲۷..........	بزرگوں کا مذاق..	۳۱
۲۸..........	فضول کام..	۳۱
۲۹..........	حضرات صحابہؓ کو تسلی..	۳۲
۳۰..........	کلمات ترحم..	۳۳
۳۱..........	حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ..	۳۴
۳۲..........	تمام امراض کی جڑ..	۳۵
۳۳..........	ضرورت اصلاح باطن..	۳٦
۳۴..........	اجزائے دین..	۳٦
۳۵..........	اجزائے دین اور ہماری کوتاہی..	۳٦
۳٦..........	صرف اصلاح ظاہر کافی نہیں..	۳۷
۳۷..........	تاویل کا مرض..	۴۰
۳۸..........	ضرورت اصلاح..	۴۱
۳۹..........	امراض قلب..	۴۲
۴۰..........	تعلق مع اللہ قائم کرنے کی ضرورت..	۴۲
۴۲..........	دل کو فارغ رکھنے کی ضرورت..	۴۳
۴۲..........	خیال محض فضول چیز ہے..	۴۴
۴۳..........	خیال پر ایک معقولی کی حکایت..	۴۵
۴۴..........	خیال کی حقیقت..	۴۵
۴۵..........	قلب کو خیالات سے پاک رکھنے کی ضرورت..	۴۷
۴٦..........	امر حیرت..	۴۷
۴۷..........	اخبار الجامعہ..	۴۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ

الحمد للہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ و رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و علیٰ الہ و اصحابہ و بارک وسلم **امابعد!**

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (۱)

ایک ضروری مضمون

یہ جملہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک مضمون کی ضرورت عجیب عنوان سے ارشاد فرمائی ہے جو مجمل (۲) طور پر ترجمہ سے اور مفصل طور پر شرح سے ظاہر ہوگی۔ وہ مضمون بظاہر سرسری معلوم ہوتا ہے مگر واقع میں نہایت ضروری ہے اور ہم لوگوں نے اسی طرح اکثر ضروری مضامین کو سرسری (۳) سمجھ کر چھوڑ دیا ہے اور سرسری ہونا اس مضمون کا عنوان سے مفہوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے معمولی الفاظ میں اس کی ضرورت کو ظاہر کیا ہے، مقدمات اور شکل کی صورت میں اس کو بیان نہیں فرمایا۔

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سہل ہونے کی وجہ

اور یہ عادت ہے انبیاء علیہم السلام کی کہ تعلیم میں بہت سہولت فرماتے ہیں ان کی تعلیم میں کہیں پیچیدگی اور الجھن نہیں ہوتی۔ بخلاف دوسرے اہل فنون کے کہ ان کی

---

(۱) ''بے شک اللہ تعالیٰ غافل قلب سے دعا قبول نہیں فرماتے'' مسند احمد: ۲/۱۷۷، الترغیب والترہیب: ۲/۴۱۹ (۲) اجمالی طور سے (۳) معمولی۔

تعلیم میں پیچیدگی اور الجھن ہوتی ہے بلکہ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ پیچیدگی اور الجھن ہو اور یہ کبھی تو اظہار کمال کے لیے ہوتا ہے کہ ہمارے ایسے دقیق (۱) علوم ہیں اور کبھی یہ پیچیدگی اور الجھن قلت شفقت (۲) کی وجہ سے ہوتی ہے کہ ان کو اس کی پروانہیں ہوتی کہ کسی کو یہ فن آوے یا نہ آوے۔ لہٰذا یہ لوگ ان فنون کے بیان میں سہولت کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ پہلی صورت میں تو عدم سہولت کا اہتمام ہوتا ہے کہ فن کو قصداً ایسا مشکل کر کے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہ آسکے۔ جب ہی تو ان کا کمال ظاہر ہوگا۔

اہل دنیا کا حال

اور دوسری صورت میں عدم اہتمام ہے سہولت کا کہ بے پرواہی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اتفاق سے کبھی سہل بھی ہو جاوے تو ہو جاوے لیکن ان کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ سہولت ہو ان دونوں صورتوں میں یہی فرق ہے۔ ایک میں قصداً مضمون کو مشکل کیا گیا ہے اور دوسری میں سہولت کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ پہلی صورت میں مضمون ہمیشہ مشکل ہوگا اور دوسری صورت میں کہیں مشکل ہوگا اور کہیں نہیں ہوگا۔

لیکن اس بات میں دونوں صورتیں شریک ہیں کہ مضمون سہل نہیں کیا گیا اور نیز اتنا عام فہم تو کبھی نہ ہوگا جتنا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ قصداً اہتمام سہولت کا کیا جاوے، غرض دیگر علوم وفنون میں ہمیشہ پیچیدہ تقریر اور گنجلک (۳) مضامین ہوتے ہیں جیسے بعض شعراء اپنی نظم میں لغت بہت نئے نئے داخل کرتے ہیں تاکہ قادرالکلام اور فاضل سمجھے جاویں یا بعضے نثر میں بھی نئے نئے اور مشکل اور غریب لغت داخل کرتے ہیں اور اس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں، بعضے عربی داں عربی کی عبارت ایسی لکھتے ہیں کہ بغیر قاموس اور صراح (۴) کے سامنے رکھے ہوئے وہ سمجھ ہی میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح بعض فارسی داں ایسی فارسی لکھتے ہیں کہ اس میں ضرورت سے زیادہ عربی لفظ مفرد اور مرکب داخل ہوتے ہیں اور آج کل اردو دانوں میں تو یہ مرض بہت ہی ہے کہ کہنے کو تو ان کی عبارت اردو ہوتی ہے مگر بعض جگہ تو آدھی انگریزی اس میں شامل ہوتی ہے اور یہ

(۱) باریک (۲) شفقت کی کمی (۳) الجھے ہوئے مضامین (۴) عربی ڈکشنری۔

نہیں کہ وہ اردو لکھ نہیں سکتے کیونکہ اردو تو مادری زبان ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جتلانا چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی کے ایسے قابل ہیں کہ انگریزی گویا ہماری مادری زبان ہوگئی ہے۔ یہ خبط اخباروں میں زیادہ ہے حالانکہ اخبار کے موضوع کے یہ بات خلاف ہے کیونکہ اخبار سے تو خبروں کی اشاعت اور عام کرنا مقصود ہے اسی واسطے اخبار اردو کا نکالا جاتا ہے مگر جب اس میں آدھی انگریزی شامل ہے تو خبروں کو عموم کہاں ہوا۔ اس صورت میں تو ان مضامین کو انگریزی دان لوگ ہی سمجھیں گے اور ظاہر ہے کہ انگریزی دان ایک خاص جماعت ہے تو اخبار عام کہاں ہوا۔ یہ کیسی کھلی ہوئی بات ہے مگر اہل اخبار کی اس پر نظر نہیں۔

تصنع بھی عجیب مرض ہے

یہ تو اہل دنیا کا حال ہے۔ بعض اہل علم علوم شرعیہ میں بھی لغات ٹھونستے ہیں جس کا منشاء زیادہ تر تصنع ہے (۱) اور یہ تصنع بھی عجیب مرض ہے اس کی جب عادت ہوجاتی ہے تو اس میں کچھ لطف آنے لگتا ہے۔ ایک رئیس صاحب کو مرض تھا کہ ہر بات میں موٹے موٹے لغت بولتے تاکہ لیاقت اور قابلیت خوب ظاہر ہو مگر ایسے لوگ عوام ہی میں بیٹھ کر خوب لیاقت بگھارا کرتے ہیں۔ اہل علم کے سامنے بولیں تو معلوم ہو اول تو اہل علم کے سامنے ایسی ہمت ہی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی ہمت کرے بھی تو راز کھل جائے اور غلطی پکڑ لی جاوے تو ان رئیس صاحب کو ایک دفعہ کاشتکاروں سے یہ پوچھنا تھا کہ بارش ہوئی ہے یا نہیں تو سیدھی بات تھی، یوں پوچھ لیتے کہ بارش ہوئی یا نہیں یا مینہ برسا یا نہیں مگر ان صاحب نے کس قدر گت بنائی اس ذرا سی بات کی۔ آپ ان کاشتکاروں سے پوچھتے ہیں کیوں صاحبو! امسال کشت زار گندم پر تقاطر امطار (۲) ہوا یا نہیں، وہ کاشتکاران کے منہ کو دیکھنے لگے، گنوار ہوتے ہیں بڑے ذہین شہری لوگ تو چکنے چپڑے بہت ہوتے ہیں بعض موقع پر ایسی بات کہہ اٹھتے ہیں کہ شہری کو کبھی بھی نہ سوجھے ان میں

(۱) بناوٹ (۲) اس سال گندم کے کھیتوں میں بارش ہوئی کہ نہیں۔

سے ایک اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا اس وقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں چلو، جب یہ آدمیوں کی بولی بولیں گے اس وقت آنا۔

غرض عنوان کو مشکل اس واسطے کیا جاتا ہے تاکہ کوئی سمجھے نہیں کوئی ان سے پوچھے کہ پھر بات ہی کیوں کہی جب اس کا سمجھانا ہی مقصود نہیں، ایسی عبارت تو اس کا مصداق ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا　　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض شعراء اور اہل زبان کو بھی یہ خبط ہوتا ہے کہ قصداً اپنی عبارت کو مشکل کرتے ہیں، باقی عقلاء کے علوم وفنون کچھ تو مشکل ہوتے بھی ہیں لیکن زیادہ پیچیدگی طرز بیان سے بھی ہوجاتی ہے۔ دیکھئے فلسفہ ومنطق کو بڑا مشکل فن مانا جاتا ہے۔ حالانکہ فن درحقیقت زیادہ مشکل نہیں اس کا بیان البتہ بہت پیچیدہ ہے، غرض عقلاء کے فنون کوہ کندن وکاہ برآوردن (۱) کا مصداق ہیں کہ بہت سے مبادی اور مقدمات (۲) کو پیش نظر کر کے ان کے مطلب تک پہنچنا ہوتا ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں ان میں محنت بہت اور حاصل کم ہے بخلاف علوم شرعیہ کے کہ ان میں اس کا عکس ہے کہ محنت کم ہے اور حاصل بہت ہے۔

علوم محمودہ اور مذمومہ (۳) کی مثال

ایک طالب علم نے علوم محمودہ اور مذمومہ کے متعلق خوب فیصلہ کیا اس کی ایک فلسفی سے بحث ہوئی، فلسفی نے کہا دیکھو ہمارے علوم کیسے دقیق ہیں کہ تم جیسوں کی سمجھ میں بھی نہ آویں اور تمہارے کیا علم ہیں کہ نماز فرض ہے وضو ایسے ہوتا ہے اس میں کیا باریکی ہے اس نے کہا کہ تمہارے علوم تو ایسے ہیں جیسے سور کا شکار کہ مشکل تو اس قدر کہ گھوڑا بھی چاہیے اور بہت سے آدمی بھی چاہئیں اور ہتھیار بھی چاہئیں اور اس پر جان کا بھی خطرہ اور حاصل کیا ہوا سور جو سسرا نہ کھانے کا نہ کسی مصرف (۴) کا۔ اور ہمارے

(۱) پہاڑ کھود کر تنکے حاصل کرنے کے مترادف ہے (۲) ان علوم کو سمجھنے کے لیے بہت سے مبادیات اور مقدمات کو سمجھنا پڑتا ہے پھر ان کا مطلب سمجھ میں آتا ہے (۳) اچھے اور برے علوم (۴) کام۔

علوم ایسے ہیں جیسے کبوتر کا شکار جو بے بندوق کے بھی مل جاوے۔ غلہ (۱) ہی سے مارلو جال ہی سے پکڑلو اور ہر جگہ کثرت سے ہے۔ کہیں دور جانے اور کسی سامان کی ضرورت نہیں اور ایسا بے خطر کہ حملہ بھی کچھ نہیں کرتا، غرض نہایت سہل اور بے خطر اور پھر کام کا۔ کھانے کے کام میں آتا ہے زبان کا بھی مزہ اور غذا بھی۔ تو یہ شکار اچھا یا وہ شکار اچھا کہ جان ماری اور محنت کی اور خطرہ میں پڑے اور اخیر نتیجہ نکالا جاوے تو حاصل کچھ بھی نہیں، مردار اور نجس العین (۲) ہے۔

ایسا ہی تمہارا فلسفہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کرلیا اور آخر نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں ہوا، سوا اس کے کہ اشراقیین کی یہ رائے ہے اور مشائین کی یہ رائے ہے، معلوم نہیں کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن سے ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کردیا، اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی اور تمہیں کیا ملا کونسا ثواب، مشائین (۳) یا اشراقیین (۴) کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔

حکماء اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں فرق

بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں اور فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں۔ ایک ذرا سی بات ہے مگر وہ طے ہی نہیں ہوتی خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیئے اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں (۵)، دقیق بے شک ہیں مگر اس وقت کا کیا حاصل ہے اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتد بہ (۶) حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں لیکن یہاں حاصل کے نام صفر (۷) ہے تمام عمر اسی لوٹ پوٹ میں رہو کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا ٹھیک

(۱) غلیل کے غلہ یعنی پتھر سے بھی شکار کرلو (۲) اس کی ذات ہی ناپاک ہے (۳) ارسطو کے پیروکار فلسفیوں کی یہ رائے (۴) افلاطون کے پیروکار جو طریقہ الہام پر یقین رکھتے ہیں (۵) مشکل اور گہرے ہیں (۶) فائدہ مند (۷) حاصل کیا ہوا کچھ بھی نہیں۔

ہے اور اگر طے بھی ہوجائے کہ امر حق یہ ہے تب بھی اس کا کچھ حاصل نہیں، صرف ایک بات کا علم ہوگیا اس سے کام کونسا نکلا۔ دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات (۱) ہیں کہ ان کی وجہ سے اس بحث کو معرکۃ الاراء (۲) ٹھہرالیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے یہ ذراسی بات ہے مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کردی ہیں، کوئی کہتا ہے مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے پھر سب طرف سے وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الٰہی توبہ دماغ پریشان ہوجاتا ہے اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں اگر تحقیق ہو بھی گیا اور امر واقعی معلوم ہوگیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو اور اگر تحقیق نہ ہوا اور امر حق معلوم نہ ہوا تب بھی ثمرہ (۳) نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مترتب ہوگا۔

بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی معجون کھاویں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اس کی ترکیب (۴) کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی، لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے اور وہ کھالیتے ہیں اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مترتب ہے برابر حاصل ہوتی ہے حالانکہ ترکیب پکانے کی کسی کو بھی نہیں آتی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی، وہ پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم ہے کیونکہ اسے پلاؤ کھانے کو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا وہ ہے جس کو دوسرے لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ علم باورچی کو ہے اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے، صاحب علم ثمرہ سے محروم ہیں اب فرمائیے کہ علم اچھا یا ثمرہ۔

علوم حکماء اور علوم شرعیہ کا فرق

یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی ہیں

(۱) جھگڑے (۲) قابل قدر (۳) نتیجہ (۴) کیسے بنایا گیا ہمیں پتہ ہونا ہو نفع پھر بھی ہوگا۔

اور انہوں نے ان کو منتہائے (۱) نظر قرار دے رکھا ہے اور ثمرہ حاصل ہے شرعیات جاننے والوں کو انبیاء علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھلایا ہے مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھلایا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے،

چو دم برداشتم مادہ برآمد (۲)

اور یہ میں غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انہوں نے تمام تمام عمر سر مار کر طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں اب دیکھ لیجئے کہ وہ کارآمد ہیں یا نہیں، جب غلط ہیں تو کارآمد کیسی تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی، بناء تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے (۳) یعنی شفقت لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا، یہ بڑی نادانی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے بعضے مدرس درس کے وقت گٹھل تقریر کرتے ہیں اور بات خواہ معمولی ہی سی ہو مگر اس کو موٹے موٹے الفاظ میں اور پیچیدہ عنوان سے بیان کرتے ہیں اور طالب علموں کا بھی آج کل یہی مذاق ہو رہا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی مدرس کے بڑے معتقد ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بڑے قابل شخص ہیں اور کتاب خوب پڑھانا جانتے ہیں اور جو محقق لوگ ہیں وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل کر کے بیان کر دیتے ہیں مگر بعض طالب ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ ان کی تعلیم سرسری اور عامیانہ ہے اور یہ تو بازاری شخص ہیں، خوب یہ قدر ہوئی ان کی لیاقت کی اور ان کو اس شفقت کے بدلہ میں کہ انہوں نے مضمون کو ایسا سہل (۴) کر دیا تھا کہ بات سمجھ میں آ گئی۔ یہ خطابات عطا ہوئے، اس احسان کا بدلہ یہی ہے کہ عامی اور

(۱) آخری منزل (۲) جب دُم اٹھا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو مؤنث ہے (۳) انبیاء علیہم السلام کی تعلیم آسان ہونے کی بنیاد شفقت پر ہے (۴) آسان۔

بازاری بنائے گئے لیکن سب برابر نہیں جو طالب علم سمجھدار ہیں اور جن کو تحقیق مقصود ہے وہ تو جب کتاب کے مضمون کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد استاد کی تقریر کو سنتے ہیں تو پھڑک اٹھتے ہیں اور دل سے تعریف کرتے ہیں کہ کیسے مضمون کو کس خوبی سے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا اور ان کی تقریر کو ہرگز سرسری نہیں سمجھتے۔

دقیق علوم وفنون کا مقصود

غرض یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ جو علوم وفنون مشکل ہیں ان میں طالب کو نفع پہنچانا مقصود نہیں صرف اپنا نام کرنا مقصود ہے اور ان میں طالبین کے ساتھ ان کو شفقت نہیں اور جو علوم سہل ہیں اس کے موجد کو نفع پہنچانا مقصود ہے اس لیے محض شفقت کی بنا پر سہولت کو مدنظر رکھا ہے کیونکہ شفیق کو نام سے بحث نہیں ہوتی۔ دیکھئے باپ اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس میں کما حقہ لیاقت پیدا ہوجائے اس کے اخلاق بھی درست ہوجائیں، تہذیب میں بھی کوئی کسر نہ رہے، تعلیم میں بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے۔ حتی کہ باپ اس میں بھی دریغ نہیں کرتا کہ بیٹا ان سب باتوں میں اس سے بھی بڑھ جائے مگر باوجود اس کے نام کرنا اور دکھلانا کبھی نہیں چاہتا۔ حتی کہ اس کو اپنی طرف انتساب بھی مقصود نہیں ہوتا کہ یوں کہا جاوے کہ اس کو اس کے باپ نے اس قابل بنایا ہے بس محض شفقت سے بدوں کسی غرض کے یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا اعلیٰ درجہ کا انسان ہوجائے پھر دیکھئے کہیں باپ بھی بیٹے کو الجھن میں ڈالتا ہے، ہرگز نہیں بلکہ مشکل سے مشکل کام کو آسان ذرائع سے سکھلاتا ہے تو کیا بیٹے کو یہ کہنا چاہیے کہ یہ تو معمولی باتیں ہیں اور میرا باپ کسی قابل نہیں جو مجھے مشکل کاموں میں نہیں ڈالتا، انصاف تو یہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ محض باپ کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ سہولت پسند ہے۔

شفقت انبیاء علیہم السلام

حضرات انبیاء علیہم السلام کی شفقت اُمت پر نہایت درجہ ہوتی ہے کہ باپ کی شفقت بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں اور اس کی تصدیق قرآن شریف سے ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۱) ’’یعنی آپ کی حالت یہ ہے کہ شاید آپ اپنی جان کھودیں گے اس رنج میں کہ یہ مومن نہیں ہوتے‘‘ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جان پر کھیل کر امت کے واسطے محنت کی ہے اس عنوان سے بے حد محبت اور شفقت ٹپکتی ہے یہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ نے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ بطور مبالغہ کے فرمادیا ہے کہ آپ اپنی جان کھودیں گے کیونکہ حق تعالیٰ کے کلام میں مبالغہ نہیں ہوتا کلام اللہ شاعرانہ کلام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نظم میں نہیں اتارا گیا کیونکہ نظم کے حسن میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں مبالغہ ہو، دیکھئے شاعروں کے کلام میں کس قدر مبالغہ ہوتا ہے بلکہ شعر اتنا ہی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے جتنا اس میں مبالغہ زیادہ ہو، جتنے بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے جاویں اتنی ہی تعریف کی جاتی ہے۔ خدوخال اور کمر کی تعریفیں شعراء کے کلام میں دیکھ لیجئے کہ کیسی ہیں، الٰہی توبہ مبالغہ سے گزر کر کذب تک نوبت آگئی ہے۔ قرآن شریف تو محض نصیحت ہے۔

کلام الٰہی کی نئی بات

اس میں مبالغہ کی کیا ضرورت اور کیا گنجائش ہے قرآن شریف میں سچی سچی باتیں ہیں اور جو قصے ہیں وہ بھی سچے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ سچا قصہ ہمیشہ مبالغہ سے خالی ہوتا ہے، دیکھ لیجئے جو قصے بالکل سچے ہیں اور جن میں صرف تاریخی واقعات نقل کیے گئے ہیں ان میں مبالغہ کہیں نہیں ہوگا بلکہ ان کی عبارت شاعرانہ بھی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے پڑھنے والوں کو ان میں کچھ لطف نہیں آتا مگر کلام الٰہی میں یہ نئی بات ہے کہ باوجود سیدھا سیدھا کلام ہونے کے اور باوجود سچے قصے ہونے کے اس میں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ نہایت دل کش (۲) ہے اس کی عبارت بھی ایسی ہے کہ پڑھنے سے لطف آتا ہے، سچے کلام کو دلربا کبھی نہ دیکھا ہوگا مگر قرآن شریف باوجود سچا کلام ہونے کے اعلیٰ درجہ کا دلربا بھی ہے یہ اعجاز ہے قرآن شریف کا۔ حسن بمقابلہ دوسرے کلاموں کے ایسا ہے جیسے ایک شخص تو قدرتی حسین ہے کہ خود ہی دلربا ہے نہ اس کو کسی بناوٹ کی ضرورت ہے نہ اس

(۱) الشعراء: ۳ (۲) دل کھینچنے والا۔

کا حسن کسی وقت جا سکتا ہے اور ایک وہ حسین ہے جو بنا ٹھنا بیٹھا ہے مانگ پٹی جمی ہوئی ہے زیور سے آراستہ ہے اس کا ساز و سامان بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اس کا حسن محض بناوٹ ہی بناوٹ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ حسن اس حسن خداداد کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں ہے، کتنی ہی بناوٹ کی جاوے مگر وہ دلربائی اس میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے جو خداداد حسن میں ہے آخر قدرتی قدرتی ہے اور مصنوعی مصنوعی ہے۔ یہ حسن نہ اس کے برابر دل کش ہے نہ اس کو قیام ہے (۱) ابھی ساز و سامان زیور الگ کر دو، مانگ پٹی بگاڑ دو تو بس کچھ بھی نہ رہے، بخلاف قدرتی حسن کے کہ وہ ہر وقت یکساں ہے، یہی حالت کلام الٰہی کی ہے کہ اس میں مبالغہ نہیں، جھوٹ نہیں، تصنع (۲) اور تکلف نہیں، پھر بھی دلکش ایسا ہے کہ دوسرا کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔

کلام اللہ میں مبالغہ نہیں

خلاصہ یہ کہ کلام اللہ میں مبالغہ نہیں ہے پھر جو فرماتے ہیں: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳) ''شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر رنج کرتے کرتے اپنی جان دیدیں گے'' تو یہ الفاظ ضرور اپنے حقیقی اور سیدھے سیدھے معنی پر محمول ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے واسطے ضرور اتنی کوشش اور مشقت کی ہے جس میں جان بھی کھوئی جاتی تو تعجب نہ ہوتا۔

اب دیکھ لیجئے کہ وہ بات سچ ہوگئی یا نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو اُمت کے ساتھ ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے وہ تو بے لاگ اور بلا کسی طمع (۴) کے جس طرح بھی ان سے بن سکے امت کی خیر خواہی کرتے ہیں اور دل وجان سے یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی اصلاح ہو جاوے اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شفقت کی کوئی نظیر دنیا میں موجود نہیں۔ اگر کچھ ناتمام نظیر ہے تو باپ کی شفقت ہے بیٹے کے ساتھ کہ باپ بلا کسی طمع اور بلا کسی غرض اور بلا کسی عوض کے بیٹے کی خیر خواہی کرتا ہے اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ یہ درست کیوں نہیں ہو جاتا اور اسی رنج میں تڑپتا ہے اس کے سوا اور کوئی نظیر

(۱) نہ باقی رہنے والا (۲) بناوٹ (۳) الشعراء: ۳ (۴) بغیر کیس لالچ کے۔

اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت کی نہیں ہے، باپ کو بیٹے کی تربیت میں کبھی یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ میرا نام ہو اور دس آدمیوں کے منہ سے تعریف سنوں یہی حال انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ ہمہ تن اُمت کی اصلاح میں کھپ جاتے ہیں اور ان کو اس سے کسی قسم کا بدلہ مقصود نہیں ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے واسطے کس قدر مشقتیں اور نااہلوں سے تکلیفیں اٹھائیں لیکن ان کا برا نہیں چاہا ایسے شخص سے یہ کب ہوسکتا ہے کہ تعلیم کو مشکل کردے ہرگز نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو منظور یہ تھا کہ ہم راہ پر آویں اور کسی الجھن میں نہ پڑیں اس واسطے تعلیم کو نہایت سہل کیا۔

بعض شفیق مصنفین

اسی طرح مصنفین میں بھی جو شفیق ہوتے ہیں وہ اپنی کتاب کو مشکل نہیں کرتے کیونکہ ان کو غرض یہ ہوتی ہے کہ ہماری کتاب سے فائدہ اٹھایا جاوے نہ یہ کہ ہمارا کمال اور ہماری لیاقت (۱) ظاہر ہو بعض شفیق مصنفین نے تو کتاب میں اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ دیکھئے کافیہ اور شافیہ میں مصنف نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ پھر دیکھو دونوں کیسی مقبول ہوئیں، مصنف نے تو نام بھی نہیں لکھا تھا لیکن خدا کی قدرت ہے کہ دنیا بھر میں اس کتاب کی اور صاحب کتاب کی کیسی شہرت ہوگئی۔ خوب کہا ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو   کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقارا (۲)

اس کا راز یہ ہے کہ بنائے مقبولیت خلوص (۳) ہے جس کام میں جتنا خلوص ہوتا ہے اتنا ہی مقبول ہوتا ہے اور اس میں اتنی ہی برکات ہوتی ہیں اور ازخود لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف کشش ہوجاتی ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

کعبہ را ہردم تجلی میفزود   ایں ز اخلاصات ابراہیم بود (۴)

کعبہ میں اینٹ اور پتھر ہی تو ہیں مگر رکھے گئے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام

(۱) قابلیت (۲) ''اگر شہرت کی خواہش رکھتے ہو تو گوشہ تنہائی کے جال میں پھنسو اس لیے کہ عنقا کے نام کی گوشہ گیری ہی کی وجہ سے شہرت ہے'' (۳) مقبولیت کی بنیاد خلوص ہے (۴) ''کعبہ کے لیے ہر وقت تجلیات کی زیادتی ہوتی ہے صرف اس لیے کہ اس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خلوص نیت سے رکھی تھی''۔

کے ہاتھوں سے جن میں سراسر اخلاص تھا، اسی لیے اس میں انوار وتجلیات وبرکات ہیں اور غایت درجہ دلکشی ہے اور اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا کعبہ (۱) بھی بنایا گیا تھا جو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اس سے بڑھا ہوا تھا مگر اس میں یہ باتیں پیدا نہ ہوئیں اور جو حشر اس کا ہوا سب کو معلوم ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ بناء ابراہیمی میں خلوص تھا اور اس بناء میں خلوص تو کیا ہوتا خلوص کا مقابلہ کیا گیا تھا تو اثر میں بھی مقابلہ ہوا۔

اظہار لیاقت سے دوسرے کو فائدہ نہیں پہنچتا

بس یہ راز ہے مقبولیت کا جن تصنیفات میں قابلیت دکھائی جاتی ہے ان میں مقبولیت نہیں ہوتی کیونکہ خلوص نہیں ہوتا جب نام چاہا تو خلوص کہاں اس لیے مخلص شفیق مربی کو اپنے کمال کا یا اپنی شفقت کا اظہار کبھی مدنظر نہیں ہوتا، اس واسطے وہ ہر بات میں سہل عنوان تجویز کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ اس کی عبارت کیسی ہے وہ بعض وقت دیہاتی اور گنوارو بولی (۲) بھی اختیار کرلیتا ہے اور جس طرح بھی طالب کو نفع پہنچے وہی طرز اختیار کرتا ہے نہ اسے نام سے بحث ہوتی ہے اور نہ اس سے کہ کوئی مجھے گنوار کہے گا وہ تو سراپا طالب کی نفع رسانی میں منہمک ہوتا ہے بعض وقت عبارت اس کی ظاہراً جامع اور مانع بھی نہیں ہوتی مگر ایسی ہوتی ہے کہ طالب کے ذہن میں مطلب کو اتار دیتی ہے اس سے سب کی بناء وہی شفقت ہی ہے۔ دیکھئے بچے کے ساتھ بسا اوقات بات کرنے میں باپ توتلا بن جاتا ہے اور جیسے وہ بولتا ہے باپ بھی اس کے ساتھ ویسے ہی بولنے لگتا ہے۔

شفقت کا مقتضا

اس کو مولانا نے بھی ایک شعر میں لکھا ہے جو اس وقت یاد نہیں آتا۔ اس وقت باپ کو اس سے عار نہیں آتی کہ میں کس طرح بول رہا ہوں اور کوئی مجھے توتلا کہے گا۔ وجہ

(۱) اس سے مراد وہ کعبہ ہے جو ابرہہ بادشاہ نے کعبہ شریف کے مقابل میں بنایا تھا اور اس نے کعبہ شریف کے شہید کرنے کے لیے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ ارادہ کیا تھا اس کا قصہ سورہ الم ترکیف میں مذکور ہے (۲) گنوار دیہاتیوں کے انداز میں گفتگو کرتا ہے۔

اس کی کیا ہوتی ہے۔ محض یہی کہ بچے کو حقائق سکھلانا مقصود ہوتا ہے اس لیے باپ اس کا ہمرنگ بن جاتا ہے تاکہ اس کا انس بڑھے اور جو بات اس کے ذہن میں پہنچاتا ہے وہ اچھی طرح پہنچ جائے کیونکہ جب وہ بچہ خود توتلا بولتا ہے تو اسی طرح کی بولی کو سمجھ بھی اچھی طرح سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ باپ کے اس توتلا بن جانے کو کوئی بھی برا نہیں کہتا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس کی بناء شفقت پر ہے۔ غرض شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ تعلیم سہل ہو۔ اسی واسطے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کا خاصہ ہے کہ وہ سہل ہوتا ہے تاکہ طالب کو سہولت ہو، یہ رحمت تو شکر کے قابل تھی لیکن لوگوں نے اس کو الٹا سمجھا اور افسوس ہے کہ آج کل یہی وجہ ہوگئی اس کلام کی بے قدری کی غرض چونکہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات ہم کو سہولت سے حاصل ہوگئیں اس واسطے ان کو نظر انداز کر دینا ہمارے نزدیک کچھ بات نہ ہوئی۔

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد　　　گوہرے طفلے بہ قرص ناں دہد (۱)

اے گرانجاں خوار دیدستی مرا　　　زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا (۲)

حق سبحانہ وتعالیٰ کی شان کریمی

درحقیقت دیکھو تو کہ اللہ تعالیٰ ہم کو کتنے ارزاں (۳) مل گئے کیونکہ ایک عورت کے (۴) حاصل کرنے میں جس قدر کوشش کرنا پڑتی ہے اللہ تعالیٰ کے حاصل ہونے میں اتنی بھی تو کوشش کرنا نہ پڑی مگر افسوس اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس قدر بے قدری ہوئی مگر کیا مقتضائے عقل یہی ہے کہ سہل چیز کی بے قدری کی جائے۔

دیکھئے اگر کسی کو ایک ہزار روپیہ کی تھیلی کہیں اتفاقیہ پڑی ہوئی مل جاوے تو کیا اس وجہ سے کہ وہ بے محنت مل گئی ہے اس کو پھینک دینا چاہیے کونسا عقل مند یہ کہہ سکتا ہے نہیں بلکہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اس چیز کو دیکھا جاوے کہ وہ چیز کس حیثیت کی ہے اگر

---

(۱) ''جو شخص ارزاں خریدتا ہے ارزاں ہی دیتا ہے ایک ناسمجھ بچہ ایک روٹی کی ٹکیہ کو ایک قیمتی موتی کے بدلہ خرید لیتا ہے''(۲)''اے شخص تو مجھ کو صرف اسی لیے ذلیل سمجھتا ہے کہ تو نے مجھے سستا جو خرید لیا ہے'' (۳) سستے (۴) نکاح کرنے میں۔

وہ چیز عظیم الشان اور قابل قدر ہے تو صرف اس وجہ سے کہ سہولت سے حاصل ہوگئی ہے اس کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ ایسی گراں (۱) بہا چیز بے مشقت (۲) ہاتھ آگئی ہے اور لیجئے حق تعالیٰ کی تعلیم کی جس قدر بے قدری ہوئی اس کا مقتضی تو یہ تھا کہ ہم سے اس کو ہٹالیا جاتا مگر رحمت پر رحمت دیکھئے کہ باوجود اس ناشکری اور بے قدری کے تعلیم سے بھی ہم کو محروم نہیں فرماتے ہیں۔

أَفَنَضْرِبُ عَنكُمُ ٱلذِّكْرَ صَفْحًا أَن كُنتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِينَ ۝٥ (۳)

کس قدر شفقت اور رحمت ہے کہ کجا شان خداوندی اور کجا بندہ (۴) اور اس کی یہ ناشکری اور بے قدری لیکن وہ خیر خواہی نہیں چھوڑتے، اللہ کی شان تو بڑی ہے۔

علماء ربانی کی شان

علماء ربانی کی شان بھی یہی ہے کہ لوگ ان کو کیسا ہی ستاویں اور کیسی ہی مخالفت کریں اور کیسی ہی ان کے ساتھ گستاخی کریں لیکن وہ کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے، نہ نصیحت سے رکتے ہیں وہ جب چاہیں گے بھلا ہی چاہیں گے۔ ان کا تو یہ مشرب ہوتا ہے۔

حافظ وظیفہ تو دعاء گفتن است وبس　　در بند آں مباش نشنید یا شنید (۵)

اہل اللہ کے بہت سے قصے ایسے سنے ہوں گے کہ لوگوں نے ان کو مارا پیٹا، تکلیفیں دیں، لیکن ان کے منہ سے سوائے دعا اور نصیحت کے کچھ نہیں نکلا، یہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے جب مظہر (۶) رحمت کا یہ حال ہے تو خود اصل جن کی رحمت کا یہ ظہور ہے کیا شان (۷) ہوگی، ظاہر ہے کہ وہاں تو رحمت بدر جہا زیادہ ہوگی، غرض اسی رحمت اور شفقت کا ظہور ہے کہ حق جل شانہ کی تعلیم کا یہ طرز ہے کہ اس کو نہایت آسان اور سہل رکھا ہے، بندوں کو کسی الجھن میں نہیں ڈالا۔

---

(۱) ایسی قیمتی چیز (۲) بلا محنت (۳) ''یعنی فرماتے ہیں کیا ہم تم سے نصیحت کو روک لیں اس وجہ سے کہ تم لوگ حدود سے نکل جانے والے ہو'' الزخرف: ۵ (۴) کہاں اللہ کی شان کبریائی اور کہاں بندہ اور اس کی ناشکری ونا قدری (۵) ''اے حافظ تمہارا کام تو صرف دعا کرنا ہے اور بس اس فکر میں مت رہو کہ اس نے سنی یا نہیں سنی'' (۶) جس میں اللہ کی رحمت کا ظہور ہو رہا ہے (۷) یعنی اللہ کی کیا شان ہوگی۔

مضامین کے مفید ہونے کی عجیب مثال

چنانچہ اس حدیث میں ایک نہایت ہی ضروری اور بہت ہی گہری تعلیم ہے مگر الفاظ نہایت سرسری ہیں، اس کے ترجمہ ہی سے معلوم ہوجائے گا کہ کس درجہ معمولی عنوان ہے، کوئی سخت لغت ان میں نہیں بلکہ مضمون بھی دیکھنے میں بہت دقیق (۱) اور عالی نہیں جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ تو سہل ہیں ہی مضمون بھی بہت ہی معمولی ہے کیونکہ حدیث میں تین چار لفظ ہیں جن کے معنی بھی وہ ہیں جو رات دن زبان پر آتے ہیں کوئی نئے معانی نہیں ہیں مگر وہاں تو نظر مفید ہونے پر ہے، مضمون کے دقیق وعالی (۲) ہونے پر نہیں ہے۔ مضامین کا عالی ہونا مفید ہونے کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ دیکھئے حکیم محمود خان کے نسخے باعتبار مضمون کے عالی نہیں ہوتے اور ان میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کسی شاعر کے کلام نظم یا نثر میں ہوتا ہے لیکن کام کی چیز نسخے ہی ہوتے ہیں، نظم ونثر کام کے نہیں ہوتے کیونکہ نسخوں پر صحت متفرع (۳) ہوتی ہے اور صحت کے بعد ہی سارے کام ہوسکتے ہیں، شاعر شعر بھی جب ہی کہہ سکتا ہے جبکہ دماغ صحیح اور طبیعت حاضر ہو اور یہ نسخہ کے استعمال پر موقوف ہے۔

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد (۴)

تو گو نسخہ میں مضامین عالیہ (۵) نہیں ہیں لیکن مضامین عالیہ کی جڑ وہی ہے۔ دیکھئے نسخہ میں کچھ بھی پیچیدگی نہیں ہوتی، الفاظ بھی معمولی اور اجزاء بھی معمولی۔ یہی بنفشہ کاسنی وغیرہ کہ بہت ہی معمولی دوائیں ہیں مگر محمود خان کا یہی کمال سمجھا جاتا ہے کہ ان کا نسخہ کم قیمت اور معمولی اور سہل الحصول ہوتا تھا، غرض کارآمد چیز تو نسخہ ہی ہے گو دلچسپ عبارت نہ ہو اور شعر گو دلچسپ ہے جس میں مضامین عالی ہیں مگر کارآمد مطلق نہیں۔ محمود خان کے نسخوں سے مایوس مریضوں کو فائدہ پہنچتا تھا اور بڑے بڑے کام نکلتے تھے۔ بخلاف ذوق اور مومن کے کلام کے کہ مضامین تو ان میں ایسے عالی کہ زمین وآسمان

(۱) باریک وگہرا (۲) گہرے اور بلند ہونے پر نہیں (۳) نسخے کے استعمال سے صحت حاصل ہوتی ہے (۴) ''جب دل ہی غمگین ہو اور ٹھکانہ سے نہ ہو تو شعر کب صحیح اور رنگین نکل سکتا ہے'' (۵) بلند مضامین۔

کے قلابے ملا دیئے ہیں اور لوگ ان پر وجد کرتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کذب (۱) محض پر جھومتے ہیں اور نسخہ میں دہی وتین اجزاء ہیں اور وہ بہت ہی مبتذل (۲) اور مستعمل لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذوق کی کسی غزل سے خواہ وہ کیسی ہی بڑھیا غزل ہو فائدہ کسی کو نہیں پہنچتا اور نسخہ سے فائدہ پہنچتا ہے بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ صرف اس کاغذ ہی کو گھول کر پلا دیا تو بوجہ حسن عقیدت کے شفا ہوگئی اور غزل سے کہیں ایسا نہ سنا ہوگا۔

مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوتی

غرض مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوا کرتی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر مفید ہونے پر ہے، مضمون کے عالی ہونے اور الجھن میں ڈالنے کی نہیں ہے اور قرآن میں تو ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ باوجود عدم رنگینی کے دلربائی بھی ہے حالانکہ نظم نہیں ہے اگرچہ نظم ہونے میں بھی کوئی ضرر نہ تھا کیونکہ یہ نفع تھا کہ ذرا دلفریبی بھی ہوئی مگر چونکہ اس میں تکلف تھی اس واسطے پسند نہیں کیا گیا اس میں تعلیم ہے ترک تصنع (۳) کی وہاں دلفریبی اور کسی کا دل کھینچنے کی طرف خیال ہی نہیں۔ وہاں تو دل دیتے ہیں دلربائی ان کا پیشہ نہیں بلکہ ان کا شعار دل بخشی ہے اس واسطے دلفریبی کی کیا ضرورت تھی۔ بس کام میں لگا دیا ہے اور زائد از کار (۴) باتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ غرض شریعت کی تعلیم کا یہی طرز ہے کہ بناوٹ اور الجھن کا وہاں کام ہی نہیں، سیدھے سیدھے الفاظ ہیں اور عام فہم بات ہے ہاں تعلیم ایسی ضروری اور گہری ہے کہ دوسرا ایسی تعلیم نہیں کرسکتا چنانچہ یہی تعلیم جو اس حدیث میں ہے دیکھ لیجئے اس میں کوئی تکلیف نہیں کوئی عبارت آرائی نہیں، کوئی مشکل لغت نہیں، سیدھے سیدھے لفظ ہیں اوّل ان عنوانات سے کام لیا ہے جو دن رات ہم بولتے ہیں اور بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

الفاظ حدیث کے لغوی معنی

فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (۵) ان اللہ کو

---

(۱) کھلے جھوٹ پر (۲) بہت سستے اور عام استعمال میں ہونے والے ہیں (۳) بناوٹ کو ترک کرنے کی (۴) بیکار باتوں کو (۵) المعجم الاوسط میں یہ الفاظ ہیں اَنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ المعجم الاوسط: ۵۱۰۹ ”اللہ تعالیٰ بے پرواہ دل کی دعاء قبول نہیں کرتے“ مسند احمد: ۲/۱۷۷، الترغیب والترہیب: ۲/۴۱۹

مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں۔ لایستجیبب بھی بہت مستعمل لغت ہے دعاء تو ایسا لفظ ہے کہ اردو خواں تک بھی جانتے ہیں بمعنٰی حرف ہے معنی از فارسی میں اور سے کے معنی میں اردو میں یہ بھی بہت ظاہر ہے قلب کا لفظ بھی اردو میں مستعمل ہے لاہ کو بھی اطفال مکتب (۱) جانتے ہیں کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور لھو سے مشتق ہے، لہو کے معنی غفلت کے ہیں تو لاہ کے معنی غافل ہوئے، پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ ''حق تعالیٰ دعا کو غافل دل سے نہیں قبول کرتے''۔

دیکھئے اس میں کوئی لفظ نیا نہیں کوئی معنی مشکل نہیں، ساری حدیث میں کوئی بات بھی نئی اور ناشناسا (۲) نہیں، وہ الفاظ ہیں جو دن رات بولے جاتے ہیں اور وہ معنی ہیں جن کو سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نئی بات ہے۔ شاید اس سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ پھر اس تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہوئی جب سب چیزیں وہی ہیں جو بارہا کی دیکھی بھالی اور جانی پہچانی ہیں تو اس تعلیم سے فائدہ کیا ہوا، مثلاً اگر کوئی کہے کہ اس وقت رات ہے تو یہ ایسی بات ہے جو سب کے ذہنوں میں ہے پھر اس جملہ کے کہنے سے کیا حاصل ہوگا۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ گو عنوان اس حدیث کا بہت واضح ہے اور ترجمہ بھی سیدھا سیدھا ہے اجزاء اس تعلیم کے سب معمولی اور جانے پہچانے اور شناسا ہیں مگر ان شناسا اجزاء سے نتیجہ ایسا عجیب نکالا گیا ہے جو کہ شناسا (۳) نہ تھا، نتیجہ ایسا گہرا ہے کہ کیا مجال جو کوئی دوسرا وہاں تک پہنچ سکے، ان معمولی اجزاء کو جوڑ کر اس ناشناسا نتیجہ کو شناسا کیا گیا ہے، یہ فائدہ ہوا اس کلام سے تو یہ جملہ ایسا نہ ہوا جیسے وہ جملہ تھا کہ اس وقت رات ہے۔

نسخۂ کیمیا

اب اس کی مثال ایسی ہوئی جیسے کیمیا (۴) کا نسخہ کہ بہت معمولی ادویات سے مرکب ہوتا ہے اس کے اجزاء کچھ ایسے نہیں ہوتے جو امریکہ اور جرمن سے منگانے پڑیں بلکہ وہ نسخہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک جزو معلوم ہے مگر کیمیا بن جانا ترکیب کا نتیجہ ہے وہی اجزاء ہم دن رات استعمال کرتے ہیں مگر وہ ذرا سی ترکیب

(۱) مکتب کے بچے (۲) نامانوس (۳) جس سے آدمی واقف نہیں تھا (۴) سونا بنانے کی ترکیب۔

جس سے کیمیا(۱) بن جاوے ہم نہیں جانتے اس لیے کیمیا سے محروم ہیں۔ کیمیا میں ترکیب کو بڑا دخل ہے، بعض وقت ترکیب سے مرکب میں وہ بات پیدا ہوجاتی ہے جو اس کے ہر ہر جزو میں نہیں تھی جیسے عرق کافور کہ خشک اجزاء سے بنتا ہے۔ الگ الگ ایک ایک جزو خشک ہوتا ہے مگر سب کو ایک جا کر دینے سے بدوں پانی کے پانی ہوجاتا ہے یہ صرف ترکیب کا اثر ہے جس کو یہ ترکیب معلوم نہ ہو وہ خشک اجزاء کو دیکھ کر کبھی یہ تسلیم نہیں کرسکتا کہ یہ اجزاء بدون(۲) پانی کے رقیق ہوجائیں گے اور جس نے عرق کافور(۳) بنایا ہے اس نے کوئی نئی چیز نہیں بنائی، صرف چند اجزاء کو ایک تناسب کے ساتھ ملا دیا ہے جس سے ایک نئی چیز پیدا ہوگئی جو اس ملانے سے پہلے حاصل نہ تھی۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اہل اللہ کی تعلیم میں ہے کہ عنوان ان کے نہایت سہل ہیں جن کو عامی لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ الفاظ ان کے کچھ غریب نہیں ہوتے اور قصداً مقفی(۴) کیے ہوئے بھی نہیں ہوتے ان کے یہاں شاعری سے کام نہیں لیا جاتا لیکن کمال یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کو ترکیب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس ترکیب سے وہ بات پیدا ہوجاتی ہے جو کسی دوسرے کے ترکیب دینے سے نہیں پیدا ہوسکتی یہ ہے ان کی خصوصیت جن کی بدولت ان کو تمام دنیا سے امتیاز حاصل ہے ان کے معمولی اور عام فہم الفاظ سے وہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کسی کا کان تو کیا کسی کا دماغ اور عقل بھی آشنا نہیں ہوتی اور وہ مضمون ایسا ہوتا ہے کہ بدوں ان کے بتلائے کسی کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ ایک ایک جزو کو معمولی دیکھ کر مجموعہ کو معمولی اور سرسری کہہ دینا کیسے صحیح ہے جیسے عرق کافور کے اجزاء فرداً فرداً تو معمولی(۵) ہیں کوئی ان میں سے نئی اور عجیب چیز نہیں ہے لیکن ترکیب کا یہ اثر ہے کہ بدوں پانی کے پانی بن جاتا ہے یہ ضرور عجیب ہے اس کو اس وجہ سے معمولی کہہ دینا کہ اس کے اجزاء معمولی ہیں صحیح نہیں۔

---

(۱) سونا بن جائے (۲) بغیر پانی کے پتلے ہوجائیں گے (۳) کافور کا عرق (۴) قافیہ کی پابندی بھی نہیں ہوتی (۵) اکیلے اکیلے اجزاء تو معمولی ہیں۔

کمال کی قدرومنزلت

دیکھئے کیمیا گر(۱) کے لوگ کس قدر معتقد ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، قلوب میں اس کی بڑی وقعت ہوتی ہے حالانکہ غور سے دیکھئے تو وہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ شناسا اجزاء سے ناشناسا کی رونمائی کردیتا ہے(۲) کیا مطلب کہ وہ ایسی ہی چند مفرد دوائیں جن کو ہم تم سب جانتے ہیں ملا کر وہ چیز بنا دیتا ہے جو ہم تم نہیں بنا سکتے تو اگر معمولی اجزاء سے مرکب شدہ مجموعہ بھی معمولی سمجھا جاسکتا ہے تو کیمیا کے نسخہ کو بھی معمولی سمجھنا چاہیے اور کیمیا گر کی بھی کچھ وقعت نہ ہونا چاہیے حالانکہ حالت یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کیمیا گر کا نام لگ جانے سے خلقت اس کے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے خواہ واقع میں وہ جھوٹا اور دھوکہ باز ہی ہو اور اگر کوئی واقعی کیمیا گر ہو اور لوگوں کو اس بات کا اطمینان بھی ہوجائے کہ یہ شخص جھوٹا اور مکار نہیں ہے تو اس صورت میں جو اس کی وقعت اور قدر ہوگی وہ تو محتاج بیان نہیں حالانکہ کام اس کا بھی یہی ہے کہ بہت ہی معمولی اور مستعمل اجزاء سے سونا اور چاندی بنالیتا ہے اس کے نسخہ میں ایسے اجزاء نہیں ہوتے جن کے لیے یہ کہنا پڑے کہ فلاں جگہ سے منگاؤ اور فلاں جگہ سے منگاؤ جیسے ایک طبیب کے نسخہ میں ایک دوا تھی جس کا نام بیروج الصنم ہے۔ نسخہ ایک معمولی مرض کا تھا مگر دوا ایسی لکھ دی کہ لوگ پریشان ہوگئے، عمل دشوار اور مقصود معمولی یعنی ذرا سا مرض تھا چونکہ مریض کی غرض اٹکی ہوئی تھی، جھک مارا اور بیروج الصنم کو تلاش کر کے منگوایا یہ ترکیبیں تو دق کرنے کی تھیں اور یہ کچھ کمال کی بات نہیں کامل طبیب اور کامل کیمیا گر وہ ہے جو ایسا نسخہ بتلاوے جس کے اجزاء گھر ہی میں سے نکل آویں اور نتیجہ حاصل ہونے میں اکسیر ہو ایسا نسخہ ہونا چاہیے جس کی نسبت عوام تک میں تعریف کا یہ لفظ مشہور ہے کہ فلانے حکیم ایسے تھے کہ کوڑیوں کا نسخہ لکھتے تھے اور نفع لاکھوں کا تھا۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ نسخہ قیمت میں تو کچھ کوڑیوں(۳) کا ہوتا تھا اور منفعت اور اثر میں ایسا کہ دوسرے طبیب کا روپیوں کا نسخہ بھی ایسا کامل نہ ہو یہ اس طبیب کے کمال کی دلیل ہے کہ سرسری اجزاء

(۱) سونا بنانے والے (۲) معلوم اجزاء کو ملا کر نامعلوم اجزاء کو ظاہر کردیتا ہے (۳) پیسے سے بھی چھوٹا سکہ ہوتا تھا اب نہیں ہوتا۔

سے بڑے بڑے کام نکالتا ہے اور جو فن کو جاننے والا ہے وہ اس کی قدر کرتا ہے اور مریض بھی جب دیکھتا ہے کہ ایسے کم قیمت اجزاء سے ایک بڑے مرض کو فائدہ پہنچا تو حیرت میں رہ جاتا ہے اور اس کے علم وفضل کا مقرر[1] ہوجاتا ہے اور تعجب سے کہتا ہے کہ کیسے معمولی اجزاء سے اس شخص نے نسخہ مرکب کیا ہے۔

کمال کی بات

غالباً اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ مریض کو دشواری میں ڈالا جائے بلکہ کمال کی بات یہ ہے کہ تدبیر نہایت سہل ہو اور اس پر نفع اعلیٰ درجہ کا مرتب ہو اور نسخہ کا بڑھیا ہونا یہ نہیں ہے کہ زیادہ قیمتی ہو اور دشوار اور نایاب ادویہ سے مرکب ہو بلکہ نسخہ کا بڑھیا ہونا اسی میں ہے کہ کم قیمت اور سہل الحصول[2] ہو اور وہی طبیب تعریف کے قابل ہے جو ایسا حاذق اور شفیق ہو کہ مریض کو دق[3] نہ کرتا ہو ایسے ہی شخص کا نسخہ قدر کے قابل ہوتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ جب انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ایسی ہی ہے کہ نہایت عام فہم اور سہل الحصول اور نتیجہ نہایت قیمتی تو ان کے نسخہ کی قدر کیوں نہیں ہوتی ضرور ہونا چاہیے۔ اب سن لیجئے کہ یہاں اس حدیث میں جس کا بیان میں نے شروع کیا ہے ایسے ہی معمولی اجزاء میں کوئی جزو ان میں سے ناشناسا نہیں اسی وجہ سے میں نے یہ لفظ کہا تھا کہ عنوان سرسری ہے لیکن اجزاء گو کیسے ہی سرسری ہوں مگر مجموعہ میں جو بات ہے وہ سرسری نہیں ہے اور وہ بالکل ناشناسا ہے اس کی طرف ذہن نہیں جاتا تو اس عنوان کے سرسری ہونے اور اجزاء کے معمولی ہونے کا نتیجہ عاقل کے نزدیک یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کو بے وقعتی کی نظر سے دیکھے بلکہ عاقل کو چاہیے کہ منفعت پر نظر کرے، عنوان کے سہل اور دشوار ہونے کو نہ دیکھے۔

بے قیمت مفید شے

اس کو میں ایک عقلی دلیل سے بھی ثابت کرتا ہوں دیکھئے قدرتی رفتار یہ ہے کہ ضروری اور مفید چیز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور قیمت میں ارزاں ہوتی ہے مثال اس کی

(۱) اس کے علم وفضل کا اقرار کرلیتا ہے (۲) آسانی سے حاصل ہوسکتے (۳) پریشان۔

ہوا ہے کہ ہوا ایسی ضروری چیز ہے کہ آدمی ایک منٹ کے لیے بھی اس سے مستغنی نہیں (۱) ہوسکتا۔ پھر دیکھئے کہ ہوا کی مقدار عالم میں کس قدر ہے، کوئی جگہ بھی ہوا سے خالی نہیں، پھر اس قدر ارزاں (۲) کہ اس کے کچھ دام (۳) ہی نہیں۔ ہوا چنانچہ کہیں بکتی نہیں حالانکہ سب سے زیادہ ہوا ہی بکری کی چیز ہے۔ غالباً سننے والے کے دل میں یہ خیال گزرا ہوگا کہ ہوا بھی کوئی بکری کی چیز ہے۔ صاحبو! آخر ہوا بکری کی چیز کیسے نہیں ہے اس کا تجربہ یوں ہوسکتا ہے کہ کسی کی ہوا پانچ منٹ کے لیے بند کردیجئے، دیکھئے اس کی کیا حالت ہوگی اس وقت اس کی یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ ہفت اقلیم (۴) کا بھی مالک ہو اور اس کے سامنے یہ بات پیش کی جائے کہ اگر تو ہفت اقلیم ہم کو دیدے تو ہوا تجھ کو مل سکتی ہے تو وہ سو خوشامدیں کرے گا اور اس کو منظور کرلے گا۔

ثابت ہوا کہ اس قدر قیمتی چیز ہے کہ ہفت اقلیم بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں، یہ اور بات ہے کہ حق تعالیٰ کا انعام اور فضل اس قدر بے پایاں ہے کہ ہوا بالکل مفت ملتی ہے اور اس کثیر مقدار میں موجود ہے کہ لوگ اس سے اکتاتے اور بھاگتے ہیں اور اس انعام کو ایسا بہادیا گیا ہے کہ بکنے کا نام اس کے ساتھ لگانے سے تعجب ہوتا ہے واقعی اگر ہوا کی قیمت ہوتی تو بادشاہوں کے سوا اس کو کون خرید سکتا۔

بیش قیمت بے کار شے

غرض یہ تو حالت اس چیز کی ہوئی جو سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مفید ہے کہ اس کی کچھ بھی قیمت نہیں، اب اس کے مقابلہ میں اس چیز کو دیکھئے جو سب سے کم ضرورت کی ہے وہ موتی اور جواہرات ہیں کہ کسی کام میں بھی نہیں آتے بقائے حیات ان پر موقوف نہیں کوئی کام دنیا کا ان کے بغیر بند نہیں پھر دیکھئے کہ کمیاب کس قدر ہیں کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جن کے پاس یہ موجود ہوں بہت سے آدمی ایسے ہیں جنہوں نے جواہرات کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ پھر قیمت اس قدر گراں کہ کسی چیز کی بھی نہیں۔ سنا گیا ہے کہ بعض بعض جواہرات ایک ایک اقلیم کا مول رکھتے ہیں۔

(۱) بے نیاز نہیں ہوسکتا (۲) سستی (۳) قیمت ہی نہیں (۴) سات ولایتوں کا مالک دنیا کو سات حصوں میں تقسیم کرکے اس کو اقلیم کہتے ہیں مطلب یہ ہے پوری دنیا دے کر بھی خریدنے کو تیار ہوگا کیونکہ زندگی اس پر موقوف ہے۔

غرض دیکھ لیجئے کہ ہوا بے قیمت چیز تو کام کی ہے اور موتی اس قدر قیمت کی چیز کام کی نہیں ہے ثابت ہوا کہ زیادہ گرانی اور کم یابی دلیل ہے بے سود ہونے کی اور ارزانی اور سہل الحصول (۱) دلیل ہے مفید ہونے کی لیجئے دلیل عقلی سے بھی ثابت ہوگیا کہ کسی چیز کا سہل اور معمولی ہونا دلیل اس کے حقیر ہونے کی نہیں بلکہ اس کا عکس ہے (۲) کہ سہل الحصول وہی چیز ہوتی ہے جو واقع میں زیادہ مفید ہوتی ہے اسی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم چونکہ سہل ہوتی ہے اس لیے زیادہ مفید ہوتی ہے۔ یہ راز ہے شریعت کی تعلیموں کے سہل ہونے کا، خوب سمجھ لو اور کبھی بے قدری نہ کرو، یہ تعلیمین سب سہل ہیں لیکن اس قدر جامع اور پُر منفعت ہیں کہ کوئی دوسرا ایسی تعلیم نہیں کر سکتا۔

ایک خطرناک روحانی مرض

یہ بیان ہوا لفظ سرسری کے لفظ کے متعلق اب وہ حدیث مکرر سن لیجئے فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ (۳) اس حدیث میں ایک ایسے مرض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو نہایت دشوار اور خطرناک مرض ہے اور دشواری اس کی اس وجہ سے اور زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ مرض مخفی (۴) بہت ہے اس تک کسی کی نظر ہی نہیں پہنچتی جو لوگ اپنے امراض کا علاج چاہتے ہیں ان کا خیال بھی اس کی طرف نہیں جاتا، پھر علاج ہو تو کیسے ہو، اول تو اس زمانہ میں دین کی طرف توجہ ہی نہیں، لوگوں کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ خود بھی دنیا کے درپے ہیں اور تعلیم بھی دنیا ہی کی رہ گئی ہے اگر ایسا بھی ہوتا کہ دنیا کے کسب میں مبتلا ہوتے مگر تعلیم صرف دنیا کی نہ ہوتی بلکہ کچھ تعلیم دین کی بھی ہوتی تب بھی شکایت نہ تھی کیونکہ اس وقت تعلیم دینی سے یہ تو سمجھ میں آجاتا کہ ہم ایک خراب چیز اور بری بلا میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے یہ امید ہوتی کہ شاید کبھی تنبہ ہو جائے اور ان بلاؤں سے چھوٹ جائیں اور جب ان بلاؤں کے بلا ہونے کا علم ہی نہ رہا تو رہائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ غرض دین کا نام ہی نہ رہا اور صرف یہ شکایت نہیں ہے

(۱) سستا اور آسانی سے حاصل ہونا دلیل ہے مفید ہونے کی (۲) الٹا ہے (۳) اَنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ "اللہ تعالیٰ قلب غافل کی دعا قبول فرماتے" مسند احمد: ۲/۱۷۷، الترغیب والترہیب: ۲/۴۱۹ (۴) پوشیدہ۔

کہ دین کی طرف توجہ میں کمی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دین سے قطع تعلق اور مبائیت(۱) پیدا ہوگئی ہے جس کو کسی چیز سے تعلق ہوتا ہے وہ چیز گو اس کو حاصل نہ ہو لیکن اس چیز کی خواہش اور اس کی طرف کشش اور اس سے مناسبت اور عدم حصول پر حسرت اور حصول کی تمنا تو دل میں ضرور رہتی ہے۔

طالبان دین کا تمسخر

مثلاً تمول(۲) ایک ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو مرغوب ہے گو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سے طبیعتوں کو مناسبت اور اس کی طرف کشش اور اس کی خواہش اور اس کے حاصل نہ ہونے پر حسرت اور حاصل ہونے کی تمنا کس قدر قلوب کے اندر موجود ہے ہر شخص کی حالت یہ ہے کہ جب کسی صاحب تمول کو دیکھے گا تو کم سے کم نظر اس کی طرف ضرور اٹھ جائے گی، آپ نے یہ بھی کبھی دیکھا ہے کہ ایسا شخص جس کو تمول(۳) حاصل نہ ہو وہ صاحب تمول(۴) پر ہنستا ہو اگر بالفرض کوئی ایسا کرتا تب کہا جا سکتا تھا کہ اس کو تمول کی خواہش نہیں بلکہ یہ اس کو برا سمجھتا ہے مگر اس کا وجود ہی کہیں نہیں ہے، دنیا کے بارے میں تو کہیں اس کا وجود نہیں مگر دین کے بارے میں علاوہ بے تعلقی کے اس کا بھی وجود ہے کہ لوگ دینداروں پر ہنستے ہیں پھر آپ ہی فرمائیے کہ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو دین سے مناسبت ہے یا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان کو دین سے مباینت(۵) ہے اگر طالبان دین پر ہنستے نہیں تب بھی کسی درجہ میں یہ کہا جاتا کہ گو دین ان کو حاصل نہیں مگر مناسبت ہے لیکن ہنسنا تو صریح دلیل ہے بجائے مناسبت کے مباینت ہونے کی جو القاب طالبان دین کو دیئے گئے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ احدیوں(۶) کی پلٹن ہے، کوئی کہتا ہے ملانٹے ہیں، کوئی کہتا ہے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے ہیں، کوئی کہتا ہے یہ دیوانے ہیں، خیر ہم تو اس لفظ سے نہیں گھبراتے کیونکہ یہ لقب وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا تھا لیکن طالبان دین کو بعض مسلمانوں کا ان الفاظ سے یاد کرنا اس کی شہادت اور اقرار ہے کہ وہ دین سے علیحدہ ہیں اور ان لوگوں کے متبع ہیں جنہوں نے

(۱) دوری (۲) مال داری (۳) مال دار نہ ہو (۴) مال دار پر (۵) بیر اور دوری (۶) سست و نکمے لوگوں کا گروہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا تھا: اِنَّکَ لَمَجۡنُوۡنٌ (۱) معلوم بھی ہے یہ کس نے کہا تھا، کفار نے اور اعداء دین نے اور دشمنان خدا نے کہا تھا، ہمیں تو اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں، ہمارے لیے تو یہ خوشی کی بات کہ ہم کو وہ لقب دیئے جاتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیئے گئے تھے ہم تو ان القاب سے خوش ہوتے ہیں پھر لوٹ کر جواب کس بات کا دیں مگر ایک جگہ جواب بھی خوب مل گیا۔ قصبہ کرانہ کا قصہ ہے کہ کسی دنیادار نے کسی دینی طالب علم کو مسجد کا مینڈھا کہا تھا اس نے کہا مسجد کا مینڈھا پھر بھی دنیا کے کتوں سے اچھا ہی ہے یہ ہے پورا جواب جس میں ایک عجیب لطف ہے کہ یہ ان کا اقراری لقب ہے بعض وقت یہ لوگ خود ہی کہا کرتے ہیں اجی ہم تو دنیا کے کتے ہیں۔ انہوں نے تو اپنے منہ ہی سے یہ خطاب لیا ہے اور اس جماعت کا کوئی آدمی اپنے آپ کو مسجد کا مینڈھا نہیں کہتا تو اگر عدالت خداوندی میں یہ مقدمہ پیش ہوا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری تذلیل کی اور ایسا لفظ کہا جو توہین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یعنی مسجد کا مینڈھا کیونکہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں توہین ہی کے طریق سے کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ توہین کے مجرم ہیں اور اگر وہ دنیا دار دعویٰ کرے کہ طالب علم نے میری توہین کی مجھے دنیا کا کتا کہا تو یہ مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ اسکے تو وہ خود اقراری ہیں یہ جواب ترکی بترکی (۲) ہوا مگر ہمیں یہ بھی پسند نہیں بلکہ ہمارا مذاق تو یہ ہے کہ وہ ہزار پھبتیاں کہیں مگر کہیں مگر ہم اس کے جواب میں پھبتیاں (۳) نہ کہیں گے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ نہیں تھا ان حضرات نے کبھی پھبتیاں نہیں کہیں ان کو حق تعالیٰ کا یہ حکم تھا، فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ (۴) یعنی منہ پھیر لو ان سے یہ حکم نہیں تھا کہ جیسے وہ کہیں ویسے تم بھی کہو، حضرات اہل اللہ میں شائستگی ہوتی ہے وہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتے اور چھچھوروں کے ساتھ چھچھورا بننا نہیں چاہتے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان تو بڑی ہوتی ہے ہمارے استاد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ کی بچپن میں یہ حالت تھی کہ جب کھیل میں لڑکے ان کو گالیاں دیتے تو وہ جواب میں ان کو گالیاں نہ دیتے تھے، بس بڑا جواب یہ تھا کہ تم ہی ہوگے ایسے، کیا مزے کا جواب ہے اور یہ بھی بچپن میں تھا کہ اتنا جواب دیدیتے تھے اور بعد میں اتنا بھی نہ تھا، یہ طریقہ رہا اہل اللہ کا۔

(۱) ''آپ دیوانے ہیں'' الحجر: ۶ (۱) برابر کا جواب ہے (۲) آوازیں کسیں (۴) سورۃ النساء: ۶۳۔

بزرگوں کا مذاق

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کو کسی نے برا بھلا کہا تو بجائے اس کے کہ لوٹ کر اس کو جواب دیتے یا برا مانتے یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرے بہت سے عیب تمہیں معلوم نہیں ہوئے ورنہ اور زیادہ برا بھلا کہتے ، دیکھئے کیا شان ہے بزرگوں کی۔ ان کا مذاق تو یہ ہے:

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے پھر برا کہنے سے کیوں اس کے برا مانتا ہے

وہ تو پروا بھی نہیں کرتے کسی کے برا بھلا کہنے کی، کیوں وہ عاشق ہیں اور عاشق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کو تو برا بھلا سننے میں مزا آتا ہے۔

نہ ساز وعشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت(۱)

عارف شیرازی کہتے ہیں:

من حال دل اے زاہد با خلق نخواہم گفت کایں نغمہ اگر گویم باچنگ ورباب اولیٰ (۲)

اس میں چنگ ورباب سے مراد ملامت ہے نہ کہ ڈھولکی او ستار کی تن تن۔ پھر وہ ان باتوں کا جواب کیوں دیں۔ ان کو لطف آتا ہے ان باتوں میں غرض ان باتوں کے جواب دینے کی پروا نہیں کرنا چاہیے ہم تو طالب علموں کو یہ فہمائش کرتے ہیں کہ جواب وسوال کے قصہ کو چھوڑو، اپنے اللہ کا نام لو جواب سوال میں کیوں وقت ضائع کیا دیکھو تمہیں کیا تعلیم دی گئی ہے۔

فضول کام

فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ’’ان من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه‘‘(۳) یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول بات میں آدمی نہ پڑے جاہل آدمی کا

---

(۱) ’’عشق کو سلامتی کا گوشہ اچھا نہیں لگتا بلکہ اس کو محبوب کے کوچہ کی ملامت اچھی معلوم ہوتی ہے‘‘ (۲) ’’اے زاہد میں اپنا حال دل خلقت سے نہیں کہوں گا اس لیے کہ یہ نغمہ اگر کہوں میں تو چنگ ورباب کے ساتھ بہتر ہے (۳) سنن الترمذی: ۲۳۱۸ حلیۃ الاولیاء: ۱۰/۱۷۱۔

جواب دینا فضول ہی ہے کیونکہ اس کا حاصل کیا اگر جواب دے ہی دیا اور اس کو ساکت ہی کر دیا تو کتنی رکعت کا ثواب ملا، اپنا اصلی کام تھا خواہ مخواہ اس کا حرج کیا، جاہل کو تو اس کی بات کا جواب بھی نہ دے۔

حضرات صحابہؓ کو تسلی

دیکھو کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بجائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذمم رکھا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا جواب تو کیا دیتے اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ سے یہ لفظ سنا نہ جاتا اور اس گستاخی کے سننے کی تاب نہ لاتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی تسلی کرتے اور فرماتے۔

الم تروا کیف صرف اللّٰہ عنی شتم قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح تھامتے تھے صحابہ کو اور بعض نے ایسے موقع پر جواب دینا شروع کیا تو یہ آیت اتری۔

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ (۲)

مطلب یہ ہے کہ بری بات کے جواب میں بری بات نہ کہیں، شیطان چاہتا ہے کہ ان میں لڑائی کرادے، سبحان اللہ کیسی تعلیم ہے اور اس سے بڑھ کر لیجئے فرماتے ہیں: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳) یعنی مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا مت کہو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسکے جواب میں حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے، اللہ اکبر کس قدر بچایا ہے بیہودہ مشغلوں سے ان سب تعلیمات کا حاصل یہی ہے کہ اپنے کام میں لگو، فضول جھگڑوں میں نہ پڑو، بری بات کے جواب میں بری بات مت کہو، یہ بھی فضول حرکت ہے یہ تعلیم تو ان کے اقوال کے جواب میں تھی۔

(۱) ''یعنی دیکھو حق تعالیٰ نے قریش کے برا بھلا کہنے کو اور سب وشتم کو مجھ سے کیسا ہٹایا ہے اور مجھے اس سے کیسا بچایا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں'' (۲) ''یعنی کہہ دیجئے میرے بندوں سے کہ وہ بات کہا کریں جو اچھی ہے'' الاسراء: ۵۳ (۳) الانعام: ۱۰۸

کلمات ترحم

اب ان کے افعال کے مقابلہ میں سنئے کیا جواب دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف دعوت اسلام کے لیے تشریف لے گئے تو ان نامعقولوں نے کیا کیا کہ لڑکوں سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پتھر پھینکوائے، جسم مبارک زخمی ہوگیا یہ حالت گزری کہ کئی وقت کھانے کو نہیں ملا، سوائے اس کے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ تھوڑی بہت باسی سوکھی روٹی تھی یا کچھ کھجور وغیرہ ہوں گی اس کو کھا کر پانی پی لیتے مگر ان کے ان افعال کے جواب میں زبان مبارک سے کچھ نہیں فرمایا بلکہ حدیث میں آیا ہے کہ ملک الجبال یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں پر موکل ہے آیا اور عرض کیا کہ مجھ کو خدا تعالیٰ نے بھیجا ہے اگر آپ حکم دیں تو ان کو پہاڑوں کے بیچ میں پیس دوں، جواب دیا کہ مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو کیا ہے، شاید ان کی نسل میں سے کوئی ایمان لے آوے۔

باوجود اس قدر تصرفات اختیار میں ہونے کے کہ ملک الجبال (۱) حاضر ہے حکم کا منتظر ہے ذرا اشارہ ہو تو سب کو خاک میں ملا دے لیکن ان کی تکلیف کو گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کے ایسے افعال کا جواب تھا جن کے سننے سے بھی غیظ پیدا ہوتا ہے اور جوش اٹھتا ہے یہ ہیں اخلاق سبحان اللہ، واقعی انبیاء علیہم السلام دشمنوں کے بھی خیر خواہ ہوتے ہیں، ملا دو پیازہ نے ایک آل نامہ لکھا ہے اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ ''الرسول خیر خواہ دشمنان (۲) واقعی گر کی بات کہی ہے حقیقت میں رسول کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ دشمنوں کا بھی برا نہیں چاہتے۔ دیکھ لیجئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس قدر شفیق اور رحیم وکریم ہیں کہ ایسے دشمنوں کو بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہ کی بلکہ ان کے ساتھ خیر خواہی کی دنیا میں بھی اور دین میں بھی، دنیا میں تو یہ کہ ملک الجبال کو ان کے ہلاک کرنے سے منع کر دیا اور دین کی خیر خواہی دیکھئے کہ انہی کے واسطے ان کے افعال کے مقابلہ میں کیا دعا فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳) کس قدر ترحم کے کلمات ہیں بس وہ حالت ہے جیسے

(۱) پہاڑوں پر مامور فرشتہ (۲) رسول دشمنوں کا بھی خیر خواہ ہے (۱) ''یعنی اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر دیجئے یہ لوگ جانتے نہیں'' الدر المنثور: ۲/ ۲۹۲۔

ایک شفیق باپ اپنے ناسمجھ بچے کی گستاخی پر کہتا ہے کہ یہ نادان ہے بھلے برے کو جانتا نہیں ایسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کو ہلاک کیوں کیا جاوے یہ ناواقف ہیں جو گویا دوسرے لفظوں میں یوں فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ نافرمانی کرتے ہیں جان بوجھ کر نہیں کرتے آپ کو یا مجھ کو انہوں نے پہچانا نہیں ورنہ ایسا کیوں کرتے، دیکھئے دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہے ان کی تکلیف تو کیا گوارا فرماتے ان کو یہ دعا دیتے ہیں کہ اے اللہ ان کو جنت میں بھیج دیجئے، ہدایت کی دعاء کرنے کا یہی مطلب ہے کہ یہ دوزخ سے بچ جائیں اور جنت میں پہنچ جائیں، اس ترحم کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اندھے تھے ان کو یہ نہیں سوجھتا تھا کہ ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب کام پیش نظر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحم آتا تھا کہ یہ کیا غلطی کر رہے ہیں کہ انجام کو نہیں سوچتے اور اپنے ہاتھوں دوزخ میں گرتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بہت چھوٹا بچہ سنکھیا(۱) کی ڈلی کو اٹھا کر منہ میں رکھنا چاہتا ہو اور باپ اس کے ہاتھ سے اس کو چھینتا ہو تو وہ بچہ مچلتا ہے اور ڈلی ہاتھ سے نہیں دیتا، جب باپ زیادہ اصرار کرتا ہے تو وہ باپ کو لپٹ جاتا ہے اور مارتا ہے اور کاٹتا ہے، اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوگا کہ باپ کو غصہ آجائے اور اس کے مارنے اور کاٹنے کے جواب میں یہ بھی مارنے اور کاٹنے لگے بلکہ آپ دیکھیں گے کہ وہ ہنستا ہی رہے گا، نہ اس کو مارے، پیٹے گا اور نہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے گا کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کھا جائے۔ بعینہ یہی حالت ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان دشمنوں کے ساتھ کہ تکلیفیں اٹھائیں، بھوکے رہے، پائے مبارک زخمی ہوگئے مگر ذرا بھی پیشانی پر بل نہیں پڑا نہ ان کا ہلاک ہوجانا چاہا نہ یہ چاہا کہ وہ اپنے حال پر اس گمراہی میں رہیں بلکہ یہی دعا فرمائی کہ اے اللہ ان کو ہدایت کر دیجئے یہ لوگ ناواقف ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ

یہ ہے طریقہ انبیاء علیہم السلام کا کہ مخالفین کے ساتھ ان کی برائی کا جواب برائی کے ساتھ نہیں دیتے، ان کے متبعین کو بھی یہی طرز رکھنا چاہیے اگر کوئی برا بھلا کہتا

(۱) زہر کی ڈلی۔

ہے کہے وہ اپنا منہ خراب کرتا ہے، کوئی احدی کہے یا ملانٹا کہے یا دیوانہ کہے اس سے کچھ تعرض مت کرو اس نے تو اپنا وقت خراب کیا تم اپنا وقت کیوں خراب کرتے ہو، بعض وقت بعض علماء کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کی بدگوئیوں پر صبر کرنے سے ان کی دلیری بڑھتی ہے لہٰذا کچھ جواب دیا جائے، میں کہتا ہوں ان کو اس کی بھی پروا نہیں کرنا چاہیے ان کی دلیری بڑھے گی تو اپنے واسطے برائی کو بڑھائیں گے، ان کا کیا لیں گے خیر یہ تو اپنی جماعت کو مشورہ تھا۔اصل گفتگو یہ تھی کہ آج کل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے الٹا ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں یہ کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہے بھی تو صرف ظاہر کی اصلاح کا نام دین رکھ لیا ہے نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں، وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی، بس اس کا نام دین ہے، ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں تو اس خفاء کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہو گئی تو اب سمجھ لیجئے کہ یہ امراض کس قدر قابل توجہ ہوئے۔

تمام امراض کی جڑ

پس اس حدیث میں ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جز وہیں، ظاہری اور باطنی۔اب تو حالت یہ ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے، باطن کی جگہ بطن (۱) لے لیا ہے۔پس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو، حلال سے ہو یا حرام سے، دھوکہ سے ہو یا اشراف نفس کے ساتھ ہو، بلا طیب خاطر ہو یا جبر سے ہو جس طرح بھی مل جائے لقمہ حاصل کر لیا جائے، ہاں بیشک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے اور بس اور اس میں بھی دو فریق ہیں ایک تعلیم یافتہ اور ایک عوام۔عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین، الٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی

(۱) پیٹ۔

وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں، خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا۔

ضرورت اصلاح باطن

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے ان پر زیادہ افسوس ہے کہ وہ اپنے قصور کے مقر بھی نہیں۔ ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطنی سے ہم محروم ہیں اور یہ تعلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آجائے گا۔ انہوں نے باطنی جزو کو ذہن سے اڑا ہی دیا، بس ظاہر پر کفایت کر لی اور اس پر ناز کر بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزاء کو، گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال لیے ہیں اس کے یہ معنی ہیں کہ گویا دوسرے اجزاء (نعوذ باللہ) فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جن کی عادت ہوگئی ہے جیسے نام مسلمانوں کا سا رکھ لینا صورت مسلمانوں کی سی بنا لینا، بہت کیا تو نماز بھی پڑھ لی بس انہی اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے۔

اجزائے دین

صاحبو! دین کے اجزاء تو یہ ہیں عقائد اعمال معاشرت معاملات اخلاق ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سن کر بھی لوگ چونکتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق۔ معاشرت بھی کوئی دین کے سکھلانے کی چیزیں ہیں یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے خود آدمی سیکھ جاتا ہے اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگا دی ہیں۔ علی ہذا معاملات میں بھی ایسی ہی باتیں کہی جاتی ہیں۔

اجزائے دین اور ہماری کوتاہی

غرض بعض اجزاء کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا، بڑی دوڑ اعمال دیانات تک رہ گئی اور وہ اعمال بھی سب نہیں ان میں سے بھی وہی لے لیے ہیں جن کی ایک رسم چلی

آتی ہے اور جس کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے چنانچہ بڑی دینداری یہ ہے کہ نماز پڑھ لی، ڈاڑھی رکھ لی، شرعی پائجامہ پہن لیا، گوشت کھالیا، صورت شکل وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی خلاصہ یعنی گویا جو ہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا صرف گنتی کے چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کرلیا۔ غرض اس انتخاب میں بھی جو رہا وہ ظاہر رہ گیا، اس کے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا بس اس ناتمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اس بیان سے ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھئے ظاہر پرست ہیں مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں کہ باطن کا درست ہونا کافی ہے ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے (۱)۔ لہٰذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا کہ یہ مسلمان ہیں۔ وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے، یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہوجائے گا اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی، اسی قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتہ (۲) کرنے کے لیے گھڑلی ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے میرے ظاہر آرائی کی مزمت (۳) سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے۔

صرف اصلاح ظاہر کافی نہیں

اس لیے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اس پر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت (۴) نہ کرلیں باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لیے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کردے گو بالفرض باطن بھی درست ہو اور

(۱) رکاوٹ (۲) دل کے بہلانے کو (۳) صرف ظاہری اصلاح کی برائی بیان کرنے سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ خوش ہوں گے (۴) اکتفاء۔

ان بد دینوں کا تو باطن بھی درست نہیں بلکہ انہوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو بگاڑا ہی ہے باطن بھی بگڑا ہوا ہے اور یہ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا ایک ہی فرض ادا ہوتا اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لیے بگاڑا ہے کیونکہ باطن کے بگاڑنے والی ایک چیز عجب (۱) بھی ہے اس سے بچنے کے لیے ہم نے ظاہر کو بگاڑا ہے اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہوگیا۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا کہ انہوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے میں بطور جواب الزامی کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے واللہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عجب سے بچنے کے لیے کر رکھی ہے تاکہ میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتائیے آپ اس کو کیا کہیں گے یہی کہیں گے کہ جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے، فرمائیے اس کی وجہ کیا ہے؟ جب ایک شخص اپنے منہ سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں، خیر خواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں اور اس کو باغی کیوں سمجھتے ہیں۔

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوائے اس کے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے، باطن کا جب ظاہر افعال اس کے مخالفانہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ باطن اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جاوے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہے، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ باطن درست ہو اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو، خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدوں اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی، اصل بیان یہ تھا کہ آج کل

(۱) خود پسندی۔

بہت سے دیندار ایسے ہیں جنہوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ لیا ہے۔ پھر اعمال سے مراد صرف اعمال ظاہری لے لیے ہیں وہ بھی سب نہیں بلکہ معدودے چند جیسے ڈاڑھی بڑھالی، نماز پڑھ لی، وضع قطع درست کرلی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہوگئے، اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ ظاہر کا بنانا کچھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے ہیں جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں اس واسطے ان کی غلطی کو بیچ میں دفع کردیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھے ہوئے ہیں اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار (۱) بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے لہٰذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے۔ بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس مرض کی خود مریض ہی کو خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوگی کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو آتا نہیں اور بدگمانی کی کسی کو اجازت نہیں تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔

لہٰذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود (۲) اور وہی شرط علاج (۳) اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے توجیہ (۴) اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو جائز بنالیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو قلب میں اس تاویل سے ہرگز بشاشت (۵) نہیں ہوتی بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے پھر جب خود ہی کو گناہ ہونے کا علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو تو کیسے علم نہ ہوگا تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا، خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے، ظاہر بینوں کی نظر میں سرخرو ہوگئے تو کیا۔

---

(۱) مشکل (۲) کیونکہ علم ہی نہیں ہے (۳) علاج کی شرط مرض پر مطلع ہونا ہے (۴) کوئی ایسی تاویل اور توجیہ کریں گے جس سے اس کا مرض ہونا باقی نہ رہے (۵) خوشی۔

که گہے الله دروغے میزنی　　از برائے مسکه دوغے میزنی
خلق را گیرم که بفریبی تمام　　در غلط اندازی تاہر خاص وعام
کارہا باخلق آری جمله راست　　بخدا تزویر وحیله کے رواست
کار با او راست باید داشتن　　رایت اخلاص وصدق افراشتن(۱)

تاویل کا مرض

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے مگر باطن کو بگاڑ کر خدا کو دھوکہ کیسے دو گے جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہنچتی ہے دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کر کے سرخرو ہوگئے تو کیا ہوا تاویل سے(۲) اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑ جاتا ہے، اصل گناہ تو مرض تھا ہی یہ تاویل کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ(۳) نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہوسکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبہ ضرور ہوجائے گا اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑ گیا، اب تنبہ ہو(۴) تو کیونکر ہو اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ(۵) نہیں کرسکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے کوئی برائی اس کی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا، تنبیہ اور تنبہ(۶) سب اڑ گئے، اب اصلاح کی کیا امید ہو، دیکھئے کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں، بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے، اس لیے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو

(۱) ”کبھی اللہ کے سامنے جھوٹ بولتا ہے مکھن نکالنے کے لیے لسّی بلو رہا ہے مخلوق کو دھوکہ دے سکتا ہے ہر عام وخاص کے سامنے غلط بیانی چل سکتی ہے مخلوق کے سامنے تو ریاکاری چل بھی جائے گی لیکن خدا کے روبرو حیلہ سازی کہاں چل سکتی ہے وہ تو سب کام جانتے ہیں ان کے سامنے تو دل کا اخلاص اور سچائی سب عیاں ہے (۲) تاویل کرنے سے کیا گناہ گناہ نہیں رہے گا (۳) نیک طبیعتیں (۴) توجہ (۵) اس لیے آگاہ نہیں کرسکتا (۶) نہ خود توجہ ہوئی اور نہ کسی سے توجہ دلائی۔

بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں، علم ہے، عمل ہے، نماز ہے، روزہ ہے، جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی سہی، فیصلہ غلبہ سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے، برائی کم تو بھلائی ہی کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ ہم اچھے ہیں یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔ اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ(۱) قرار پاوے مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپ کا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

ضرورت اصلاح

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور ان عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہیں تو کیا اس دل کے سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی، ہرگز نہیں بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا اسی طرح اس فیصلہ سے بھی پردہ پڑ گیا تاویل بھی ایک مرض تھا، یہ بھی ایک مرض ہے وہ ایک قسم کا پردہ تھا یہ دوسری قسم کا پردہ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ نہ تسلیم کیا تھا(۲) اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا، خیال کر لیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے۔ بہرحال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آ گئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے کیونکہ اتنے موانع(۲) موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہوسکتا ہے جب مرض کی خبر ہو اور جب خبر ہی نہ ہو تو علاج کیسا، اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے تو ہمت ہار دی ہے کہ کون علاج کرے، اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے اللہ میاں بڑے

(۱) فیصلہ کرنے والا (۲) گناہ کو گناہ نہیں مانا تھا (۳) رکاوٹیں۔

کریم ہیں، ہم گنہگار سہی اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں، پھر کیوں مصیبت میں پڑے کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو، اس کے نخرے اٹھاؤ، ہر وقت اسی ادھیڑ پن میں رہو، اچھی خاصی مصیبت ہے جب اللہ میاں رحیم وکریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت اٹھانے کی وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب کام بنادیں گے، یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں اور کوئی کام خلاف شریعت کرنا نہیں چاہتے ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، حج کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے، ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

امراض قلب

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کردیا۔ اب یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ وہ باطنی (۱) امراض کیا کیا ہیں، دوسرے یہ کہ خدا کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیے یہی دو امر خلاصہ ہیں۔ آج کے بیان کے ان دونوں کا جوڑا ابھی سمجھ میں نہ آیا ہوگا لیکن آگے چل کر معلوم ہوجاوے گا یہاں اجمالاً اتنا سمجھ لیجئے کہ ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور دوسرا اس کی فرع یعنی نتیجہ اور اثر ہے وہ اصل امر ثانی ہے یعنی یہ کہ ہم کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہیے اور امر اول یعنی تحقیق امراض اس کی فرع ہے اگر یہ اصل سمجھ میں آگئی تو سب امراض کی حقیقت اور ان کا علاج معلوم ہوجاوے گا۔ اس اصل کا بیان سنئے یعنی یہ بات کہ خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیے، ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کی زیادہ شرح کی ضرورت نہیں۔

تعلق مع اللہ قائم کرنے کی ضرورت

ایک مختصر سی بات یہ ہے کہ تمام تعلقات کی بناء ہوتی ہے احسان پر، جتنا کسی کی طرف سے کسی پر احسان زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کو تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے احسانات ہم پر جس قدر ہیں محتاج بیان نہیں ہم کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب خدا ہی کے دینے سے ہے، کوئی وقت بھی ایسا نہیں جو خدا تعالیٰ کے احسان سے خالی ہو، اتنے

(۱) وہ دل کی بیماریاں کیا ہیں۔

احسانات ہمارے اوپر کسی کے بھی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، جتنے خدا تعالیٰ کے احسانات ہیں تو بناء بر قاعدہ مذکورہ ہم کو کسی سے بھی اتنا تعلق نہ ہونا چاہیے جتنا خدا تعالیٰ سے ہونا چاہیے اور اس کی بھی شرح ہوجانی چاہیے کہ تعلق کس چیز کا نام ہے، تعلق کے معنی ہیں لگاؤ اور لگاؤ سے مراد ہے دل کا لگاؤ مگر دل کا لگاؤ یہ نہیں ہے کہ دل کسی کے ساتھ دیکھنے میں چپک جائے بلکہ دل کے لگاؤ کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل اس کی طرف متوجہ رہے اور دل میں اس درجہ اس کی یاد رہے جس کو عرف میں دل میں بس جانا کہتے ہیں۔ اب آپ غور کر لیجئے کہ ہم کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ یہ تعلق حاصل ہے یا نہیں ہر شخص غور کر لے کہ رات دن میں کتنا وقت اس کے لیے ملتا ہے اگر کوئی خیال کر کے دیکھے گا تو یہ بات صحیح پائے گا کہ سب چیزوں کی یاد اور دھیان سے کم زمانہ خدا تعالیٰ کی یاد کا ہوتا ہے جن جن چیزوں کا ہمارے دل میں خیال اور دھیان رہتا ہے سب سے کم زمانہ خدا کی یاد کے لیے ملتا ہے۔ چنانچہ مال کا دھیان بھی ہم کو بہت کچھ رہتا ہے جان کا دھیان بھی اکثر رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی کا نوکر ہے تو اس کو آقا کا دھیان بھی اکثر اوقات رہتا ہے، بچوں کا دھیان بھی زیادہ رہتا ہے مگر نہیں رہتا تو اللہ میاں کا دھیان نہیں رہتا، رات دن اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دل میں یہ ادھیڑ بُن (۱) رہتی ہے کہ مال یوں کمائیں گے، یوں بڑھائیں گے، بچوں کے لیے فلاں فلاں چیز لائیں گے، نوکری میں کام اس طرح کریں گے، آقا کو یوں کارگزاری دکھائیں گے وہ خوش ہوگا، یوں ہماری عزت ہوگی، غرض کسی وقت دل اس سے خالی نہیں رہتا، میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا بیہودہ شغل ہے میاں نوکری کے کام سے تو روپے ملیں گے لیکن یہ بتلاؤ کہ اس خیال سے کیا ملتا ہے اس سے کتنے روپے ملتے ہیں، کچھ بھی نہیں مگر بایں ہمہ (۲) ان خیالات سے کوئی خالی نہیں۔

دل کو فارغ رکھنے کی ضرورت

یہ اس بات کا جواب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہر وقت یادِ خدا میں رہیں تو دنیا کا کام کیسے ہو، آخر کھانا پینا، رہنا سہنا یہ کام بھی تو کرتے ہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر بس یادِ خدا میں لگ جائیں۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کے کاموں کو منع نہیں کیا جاتا جو

(۱) سوچ بچار، تدبر (۲) اس سب کے باوجود۔

کام دنیا کی معیشت کے لیے ضروری ہے جتنا وقت اس میں صرف ہو اس کا مضائقہ نہیں مگر اس کے علاوہ اس کام کے خیال اور ادھیڑ بُن میں کیوں وقت صرف کیا جاتا ہے دل کو فارغ کیوں نہیں رکھا جاتا اور اس وقت کو خدا کے دھیان اور خدا کی یاد میں کیوں صرف نہیں کیا جاتا، دنیا کے کاموں کی جو ضرورت بیان کی جاتی ہے تو ان میں کام کی ضرورت ہے نہ کہ خیال کی، سو کام کو منع نہیں کیا جاتا بلکہ خیال کو منع کیا جاتا ہے، دنیا کا کام تو کام کرنے سے ہوتا ہے۔

خیال محض فضول چیز ہے

خیال سے تھوڑا ہی ہوتا ہے تو خیال محض فضول چیز ٹھہری، بس اس فضول چیز سے منع کیا جاتا ہے خیال تو محض بیکار ہے اس سے تو نفع کچھ بھی نہیں، ہاں کچھ نقصان ضرور ہے، خیال کی حالت شیخ چلی کی کہانی کی سی ہے کہ وہ ایک شخص کا شیرہ کا گھڑا سر پر لے کر چلے، دو پیسے مزدوری کے ٹھہرے، راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ ان دو پیسوں کے دو انڈے خریدیں گے پھر ان کو مرغی کے نیچے رکھیں گے، ایک میں مرغی ایک میں مرغا بچہ نکلے گا گ، وہ بڑے ہونگے۔ پھر اُن سے بہت سے انڈے ہونگے پھر اُن سب کے بچے نکلوالیں گے، ان بچوں کو بیچ کر بکریاں خریدیں گے، پھر ان کے بچے ہوں گے، انہیں بیچ کر بیل، پھر گھوڑے پھر ہاتھی خریدیں گے اور ان سب تجارتوں کے بعد ہم مالدار ہوجائیں گے، پھر وزیر زادی سے نکاح کریں گے اس سے لڑکا ہوگا وہ سیانا ہوکر ہم سے پیسہ مانگے گا تو ہم کہیں گے ہشت یہ جو کہا تو ان کا سر ہل گیا اور مٹکا گر گیا، شیرہ سب بہہ گیا، مالک ساتھ تھا وہ بہت خفا ہوا کہ میاں یہ کیا کیا میرا نقصان ہوگیا، کہنے لگا جا اپنا کام کر تیرا تو روپیہ دھیلی کا نقصان ہوا ہوگا، یہاں سارا بنا بنایا کنبہ غارت (۱) ہوگیا۔ حضرت خیال یہ چیز ہے کہ اس سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا ہاں یہ نقصان ضرور ہوا کہ ایک شخص کا گھڑا پھوٹ گیا اور شیرہ بہہ گیا۔ صاحبو! اسی طرح جس ادھیڑ بن اور خیال میں آپ رہتے ہیں اس سے دنیا کا بھی تو کوئی نفع نہیں کیونکہ دنیا کا نفع تو کام سے ہوتا ہے خیال سے کیا ہوتا ہے ہاں اتنا نقصان ضرور پہنچتا ہے کہ وہ وقت ضائع گیا اور یاد خدا سے محرومی رہی۔

(۱) سارا خاندان ہی تباہ ہوگیا۔

خیال پر ایک معقولی کی حکایت

خیال پر ایک معقولی کا قصہ اور یاد آیا جنہوں نے خیال سے انڈے کے سو انڈے ذرا دیر میں بنا دیئے اور ہاتھ نہ آیا خاک بھی۔ایک شخص کے دو لڑکے تھے ایک گھر سے نکل کر معقول پڑھنے چلا گیا اور مدتوں پڑھتا رہا، جب اس فن میں خوب کمال حاصل کر لیا تو گھر لوٹ کر آیا، باپ اور دونوں بھائی کھانا کھانے بیٹھے، ایک پیالہ میں دو انڈے سامنے لاکر رکھے گئے آپ کو معقول (۱) کا جوش تھا، کہنے لگے دیکھو یہ پیالہ میں دو انڈے رکھے ہیں، اس کو ہم معقول (۲) کے زور سے ابھی سو کیے دیتے ہیں۔باپ نے کہا کرو، آپ بولے دیکھو ایک یہ انڈا ہے اور ایک یہ دو ہوئے اور ایک ان کا مجموعہ تین ہوئے، پھر تین یہ اور ایک تینوں کا مجموعہ چار ہو گئے، پھر چار یہ اور ایک چاروں کا مجموعہ پانچ ہوئے۔

اسی طرح انہوں نے سو تک تعداد بڑھا کر دکھا دی اور اپنے نزدیک بڑا کمال کیا، اس میں دیر بھی لگی کیونکہ اچھا خاصا عمل کرنا پڑا اور سمجھانا پڑا مگر اس تقریر کا جواب ایسا ہوا کہ اس میں ذرا دیر بھی نہ لگی جو بالکل اس کا مصداق تھا کہ سو سنار کی اور ایک لوہار کی، باپ نے کیا کیا کہ وہ دونوں انڈے اٹھا کر ایک اپنے منہ میں رکھ لیا اور ایک دوسرے بیٹے کے حوالے کیا اور کہا مولوی صاحب یہ دو انڈے تو ہم لیے لیتے ہیں اور ۹۸ جو بچے وہ آپ کھا لیجئے۔معقولی صاحب منہ دیکھتے رہ گئے۔گو یہ کہہ سکتے تھے کہ سو انڈے جو بن گئے تھے ان میں کے ۹۸ انہیں دو کے ساتھ تھے کیونکہ وہ انتزاعی (۳) تھے اور ان کا منشاء انتزاع یہی دو تھے، جب یہ تمہارے پیٹ میں اتر گئے تو وہ سب بھی تمہارے ہی پیٹ میں اتر گئے مگر اس جواب سے معقولی کو انڈا نہ ملتا۔

خیال کی حقیقت

تو خیال کی یہ حقیقت ہے کام تو خیال سے کوئی بھی نہیں بنتا تو محض خیال ایک فضول چیز ہوئی اس سے منع کیا جاتا ہے کام جو کچھ بنتا ہے وہ تو کام کرنے سے بنتا ہے اس سے منع نہیں کیا جاتا جو کام دنیا کا آپ کو کرنا ہے کرو مگر اس کی ادھیڑ بن میں ہر وقت کیوں رہتے ہو بلکہ کام کرنے کا

(۱) علم منطق (۲) منطق کی بنیاد پر (۳) وہ انہی سے ماخوذ کئے گئے تھے انہی دو سے تو وہ بنے تھے ان کے وجود کے لیے ان دونوں کا وجود ضروری ہے جب یہ دونوں تم نے کھالئے تو گویا وہ بھی تم ہی نے کھالئے۔

جب وقت آیا اور اس کام کو طریقہ کے موافق کیا اور قلب کو فارغ کرلیا، بتاؤ اس میں کیا تنگی ہوئی اور کونسا کام معیشت کا بند ہوا، یہ جو حالت ہے کہ رات دن عورت کا خیال، بچوں کا خیال، نوکری کا خیال، دوستوں کا خیال، کسی وقت ان سے فرصت نہیں ہوتی، یہ حالت کیوں ہے حتیٰ کہ نماز بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہوتی۔ ذرا یہ تو سوچو کہ سارے کام نماز کے اندر تو ہونے ہی کے نہیں جو کچھ ہوگا نماز کے بعد ہوگا، پھر دل ان کی ادھیڑ بن میں کیوں رہتا ہے، پھر اگر آپ سے یوں کہا جاتا ہے کہ خیالات سے دل کو خالی رکھا کرو تو کیا بے جا کہا جاتا ہے یہ جو نماز میں اول سے آخر تک دل میں خیالات بھرے رہے ان سے کونسا کام بنا پھر دل کو کیوں خراب کیا لیکن کیا کیا جائے کہ ہم لوگوں نے اس کی ایسی عادت ڈال لی ہے جیسے تمبا کو کھانے والوں کو تمبا کو کی عادت ہوجاتی ہے کہ بدوں تمبا کو کے چین ہی نہیں آتا، منہ خالی خالی ادھارا ادھارا سا معلوم ہوتا ہے وہی حالت ہماری ہے کہ جب تک دل میں یہ خیالات نہ ہوں بے چینی رہتی ہے اور دل خالی خالی سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی ہوتا کہ دو ایک چیزوں کا خیال دل میں رہا کرتا تب بھی کچھ تسلی رہتی لیکن حالت یہ ہے کہ دنیا بھر کے بکھیڑے اور خیالات موجود اور غیر موجود فرضی اختراعی ہر وقت دل میں بھرے رہتے ہیں، کیا خراب زندگی ہے سارا دن اور ساری رات انہیں فضولیات کے ساتھ مشغولی رہتی ہے جو کام کی بات ہے اس کا گزر بھی دل میں نہیں ہوتا وہ کام کی بات کیا ہے؟ اللہ کی یاد اللہ کا خیال یہ کسی وقت آتا ہی نہیں اور جو کبھی آتا ہے تو چشم زدن (۱) کے واسطے اور ذرا دیر کے بعد پھر وہی بقول مولانا:

گہہ خیال میغ دماغ ولیغ ولاغ (۲) گہہ اسپہاؤ باغ و راغ

چنانچہ کہا ہے:

ہرخیال نام شان و ننگ شاں ہر خیال صلح شان وجنگ شاں

خیال کی مثال ایسی ہے جیسے دریا اور دنیا کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی جس طرح کشتی دریا پر دوڑتی ہے اسی طرح تمام کام دنیا کے خیال پر چلتے ہیں، دریا نہ ہو تو کشتی نہیں چل سکتی، اسی طرح خیال نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہوسکتا تو خیال ضروری ٹھہرا، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آدمی دل کو خیالات سے خالی کرے۔

(۱) پلک جھپکنے کی مدت کے لیے (۲) ''اگر یہ کہا جائے کہ بلا خیال کے دنیا کا کام ہوتا ہی نہیں اور کام انسان کے بہت سے ہیں تو خیال سے بھی کوئی وقت خالی ہونا مشکل ہے''۔

قلب کو خیالات سے پاک رکھنے کی ضرورت

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو خیال ہوتا ہے مقرون بالفعل (۱) یعنی وہ خیال جو کسی کام کے کرنے سے ذرا دیر پہلے دل میں پیدا ہوتا ہے کام کے لیے یہ خیال تو ضروری ہے اور یہ خیال مانع مقصود (۲) سے نہیں اس سے منع نہیں کیا جاتا مگر یہ خیال کام کے قریب ہوا کرتا ہے اور واقعی بدوں (۳) اس کے کام نہیں ہوسکتا کیونکہ کام فعل اعضاء کا ہے اور اعضاء تابع ہیں قلب کے جب تک قلب میں ارادہ نہ ہو اعضاء (۴) فعل نہیں کر سکتے اور قلب میں ارادہ جب پیدا ہوتا ہے جبکہ اول اس فعل کا خیال پیدا ہوتا ہے تو خیال کا قلب میں پیدا ہونا ہر فعل سے پہلے ضروری ہوا۔ پس یہ تو مسلم ہے کہ ہر کام سے پہلے خیال کی ضرورت ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قلب میں ہر وقت خیال کے رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ خیال کی ضرورت فعل کے لیے ہے اور فعل ہر وقت نہیں ہوتا، کوئی وقت ایسا بھی تو نکلتا ہے جو فعل سے خالی ہو سو اس وقت قلب بھی خیال سے خالی ہونا چاہیے یہ جو ہمارے عادت ہے کہ ہر وقت دل میں خیالات بھرے رہتے ہیں قطع نظر اس سے کہ کوئی کام کرنا ہو یا نہ ہو گزری ہوئی باتوں کے تصور فرضی خیالات آئندہ کی لمبی چوڑی بے ضرورت باتیں دل میں بھری رہتی ہیں یہ ضرور روکنے کے قابل ہیں اور یہ ضرور دل سے بالکل بھلا دینے کی چیز ہے جس کے ہم لوگ عادی ہو رہے ہیں اور ہم کو اس سے ایسا انس (۵) ہوا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا، کسی وقت خالی بیٹھے ہوں تو وحشت ہوتی ہے اور فوراً دل کو اس کے ساتھ مشغول کر لیتے ہیں۔

امر حیرت (۶)

حیرت کی بات ہے کہ وہ چیز جو یاد رکھنے کی تھی جس سے کسی وقت دل کو خالی نہیں ہونا چاہیے (وہ کیا ہے؟ یاد حق) اس کو تو ہم لوگ یوں بھول گئے ہیں کہ اس کے لیے وقت ہی نہیں ملتا بلکہ ذہنوں سے اس کی ضرورت ہی جاتی رہی اور وہ چیز جو بھلا دینے اور متا دینے کی تھی اور صرف ضرورت کے لیے اس کی اجازت ہوسکتی تھی اس کو ہم لوگوں نے

(۱) کام کے متصل (۲) یہ مقصود میں رکاوٹ نہیں (۳) بغیر اس کے (۴) دل میں ارادہ نہ ہو تو اعضاء سے وہ کام نہیں ہوسکتا (۵) پیار (۶) مقام تعجب۔

ایسا یاد کیا ہے کہ بلا اس کے چین ہی نہیں آتا۔ صاحبو! ذرا غور سے کام لیجئے یہ مانا کہ خیال کسی وقت ضروری چیز ہے لیکن ہر وقت اسی میں مشغول رہنا یہ کیسے روا ہے (۱) اس کی مثال تو ایسی ہوئی جیسے پاخانہ میں جانا اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ بھی ضروری چیز ہے لیکن کوئی یوں کرے کہ ایک دفعہ کی جگہ دو دفعہ پاخانہ میں جائے، ایک دفعہ تو رفع ضرورت کے لیے اور ایک دفعہ وہاں کا مزہ لینے کے لیے کہ وہاں بیٹھ کر یہ دیکھے کہ ایسی لینڈی ہے ایسا قدمچہ (۲) ہے ایسی موری (۳) ہے ایسے ایسے گجر گجر کیڑے اس میں چل رہے ہیں، فرمائیے یہ کیسا ہے آپ ایسے شخص کو منع کریں گے یا نہیں اور دوبارہ پاخانہ میں جانے سے اسے روکیں گے یا نہیں؟ اور اگر آپ منع کریں تو کیا وہ اس کا یہ جواب دے سکتا ہے کہ میاں تم پاخانہ میں جانے سے منع کرتے ہو پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے تو آپ یہی کہیں گے کہ ارے کمبخت! پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے مگر اس کو ہر وقت سونگھنا کیا ضرورت ہے پاخانہ میں جانا جس ضرورت کے لیے ہے وہ تو ایک دفعہ میں پوری ہوچکی، اب دوبارہ جانا اس بات کی دلیل ہے کہ رفع ضرورت مقصود نہیں، کچھ پاخانہ سے طبیعت مانوس ہی ہے اور وہ اچھا لگتا ہے۔

صاحبو! ایسے ہی یہ بھی حماقت ہے کہ آدمی دل کو ہر وقت خیالات میں مشغول رکھے، یہ مانا کہ خیال ضروری چیز ہے لیکن اس کو اسی حد تک تو ضروری کہہ سکتے ہیں جس حد تک اس کو رفع ضروریات (۴) میں دخل ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری ہوا اور وہی مرتبہ ہے جس کو میں نے خیال مقرون بالفعل (۵) کہا ہے اس سے زیادہ اس میں مصروف رہنا ایسا ہی ہے جیسے بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ پاخانہ میں جانا اور اس سے مزہ لینا اگر حس ہو تو ان خیالات سے ایسے ہی نفرت ہو جائے جیسے لطیف الطبع (۶) آدمی کو پاخانہ کا خیال آجاوے تو اس کو قے آنے لگتی ہے۔

نوٹ: اس وعظ کا بقیہ حصہ اگلے شمارے میں چھپے گا جس کی ابتدا اس عنوان سے ہو رہی ہے (دل کی اصل غذا)۔

---

(۱) کیسے جائز ہے (۲) بیت الخلاء میں قضائے حاجت کے لیے پاؤں رکھ کر بیٹھنے کی جگہ (۳) غلاظت و گندگی کے نکاس کا راستہ (۴) ضرورت پوری کرنے میں (۵) فعل سے ملا ہوا خیال (۶) طبع نازک۔

أخبار الجامعة

ماہ جون 2023ء

❁ 26 مئی حضرت مولانا ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ العالی مہتمم جامعہ نے بہاولنگر جامع مسجد بگی میں جمعہ پڑھایا۔

❁ 28 مئی حضرت مہتمم صاحب نے کراچی میں اپنے قریبی دوست حکیم فیض الحسن مرحوم کے بیٹے عزیزم محمود الحسن کا نکاح پڑھایا۔

❁ 29 مئی لاہور میں قرآن بورڈ پنجاب کے زیر اہتمام ایک اہم اجلاس میں شرکت کی جس میں عصرِ حاضر کے بڑے فتنہ سوشل میڈیا پر قرآن پاک اور شعائرِ اسلام کی توہین کا نوٹس لیتے ہوئے متعلّقہ اداروں سے مطالبہ کیا کہ فی الفور اِس فتنہ کو روکا جائے اور مجرمین کو عبرتناک سزا دی جائے۔

❁ 31 مئی ملتان جامعہ خیر المدارس کے سالانہ اجلاس میں شرکت فرمائی اور مختلف اُمورِ جامعہ اتفاق رائے سے طے کئے گئے اجلاس کے بعد حضرت مولانا قاری حنیف جالندھری (مدظلہ) سے مختصر مشاورت کی گئی جس میں آئندہ سال وفاق المدارس کے زیر اہتمام مسابقہ حفظ کے بارے میں لائحہ عمل مرتب کرنے پر غور کیا گیا جس پر اکابرین وفاق المدارس کے حتمی فیصلہ کے بعد مدارس کو آگاہ کر دیا جائیگا۔

❁ 4 جون: حضرت مہتمم صاحب (مدظلہ) کی زیر سرپرستی جامعہ دار العلوم الاسلامیہ لاہور میں ایک اجلاس ہوا جس میں اراکین مرکزی کمیٹی مسابقہ حفظ وفاق المدارس نے شرکت کی اجلاس میں گزشتہ سال مسابقہ حفظ کی شاندار کامیابی پر کنوینئر مسابقہ حضرت ڈاکٹر قاری احمد میاں تھانوی مدظلہ کی خدمات اور قائدانہ کردار ادا کرنے پر اراکین نے

خراج تحسین پیش کیا۔ اور اس عزم کا اظہار فرمایا کہ آئندہ بھی اکابرین وفاق المدارس سے حتمی مشاورت کے بعد مسابقہ حفظ کے انعقاد پر منظم لائحہ عمل تشکیل دے کر مدارس کو اطلاع دی جائے گی۔

❁ 11 جون: جامعہ ہٰذا میں ملک کے ایک معروف دینی پلیٹ فارم مکتب تعلیم القرآن کے تعاون سے ۲ روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ حفظ وناظرہ منعقد ہوا۔ اس پروگرام کے آخر میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے جامع ہدایات پر مشتمل اساتذہ کرام کی راہنمائی فرمائی کہ اساتذہ کرام وطلباء، والدین اور منتظمین یہ ۴ ستون مل کر اپنی اپنی ذمہ داریاں بحسن خوبی انجام دیں تو بہترین نتائج وثمرات معاشرہ میں نظر آئیں گے۔

❁ 15 جون: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے ماہانہ وعظ ''الامداد'' کے امتحان کے موقع پر طلباء سے خطاب فرمایا۔

❁ 17 جون: تعطیلات جامعہ اور عید قربان کے حوالہ سے حضرت مہتمم صاحب کی زیر سرپرستی مشاورتی اجلاس میں اتفاق رائے سے اُمور طے کئے گئے۔

❁ 26 جون: حضرت مہتمم صاحب مدظلہ ان شاء اللہ العزیز حکومت سعودیہ کی دعوت پر 15 روزہ سفرِ حج کے لیے روانہ ہوں گے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سفر کو آسان ومقبول فرمائیں۔ آمین۔

❁❁❁

❁